ISSN 0970-180X

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اجتماعی زندگی میں سب سے کم اہم لفظ میں ہے
اور سب سے زیادہ اہم لفظ آپ

جنوری ۱۹۸۸

شمارہ ۱۳۴

جلد دوم تیار

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۳۴ جنوری ۱۹۸۸

فہرست

	صفحہ		صفحہ
عمر بن عبد العزیز	۲	سب سے بڑی بھول	۱۵
زندہ یا مردہ	۶	دنیا اور آخرت	۱۶
قرآنی نظریہ کا اعتراف	۷	اجنبی دین	۱۷
ہر ایک کی کہانی	۸	شیطان کی پیروی	۱۸
زندگی کا سفر	۹	جن اور عملیات	۲۰
ممکن اور ناممکن	۱۰	تشویہ حقائق	۲۵
معذوری کے باوجود	۱۱	ایک سفر	۲۹
منفی عمل	۱۲	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۴
ذہنیت کا فرق	۱۳	ایجنسی الرسالہ	۴۸

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

عمر بن عبد العزیز

عمر بن عبد العزیز (۱۰۱ - ۶۲ ھ) بنو امیہ کے امراء میں سے تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی تعیش کی زندگی تھی۔ ان کی رئیسانہ چال اتنی مشہور ہوئی کہ اس کو عمری چال (المشیۃ العمریۃ) کہا جانے لگا۔

۹۹ ھ میں سلیمان بن عبد الملک اموی کی وفات ہوئی۔ اس کی وصیت کے مطابق حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ مقرر ہوئے۔ وہ اگرچہ بظاہر عیش و عشرت کے ساتھ رہتے تھے۔ مگر ان کے سینہ میں ایک دردمندانہ دل تھا۔ چنانچہ خلافت کے عہدہ پر تقرر کے بعد ان کی زندگی بالکل بدل گئی۔ ذمہ داری کے احساس نے ان سے دنیوی لذت و آرام کا احساس چھین لیا۔ ان کے ایک ساتھی ان کے بارے میں کہتے ہیں :

رأیتُه فی المدینة وهو أحسن الناس ملبسًا وأطیب الناس ریحًا ومن أجمل الناس فی مشیته۔ ثم رأیته بعد ذالك یمشی مشیة الرهبان۔

میں نے ان کو مدینہ میں دیکھا اور وہ سب سے بہتر لباس میں تھے۔ اور سب سے اچھی خوشبو لگائے ہوئے تھے۔ اور سب سے زیادہ امیرانہ چال چلتے تھے۔ پھر میں نے ان کو اس کے بعد دیکھا کہ وہ درویش کی چال چل رہے تھے۔

عمر بن عبد العزیز علم میں اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ ان کی بابت ایک معاصر عالم نے کہا : ما کان العلماءُ عند عمر بن عبد العزیز الا تلامیذ (عمر بن عبد العزیز کے سامنے علماء محض شاگرد معلوم ہوتے تھے)

عمر بن عبد العزیز سے پہلے بنو امیہ کے خلفاء نہایت شان و شوکت کے ساتھ رہتے تھے، مگر انھوں نے اس قسم کی تمام چیزوں کو چھوڑ دیا۔ خلافت کے عہدہ پر فائز ہونے کے بعد ان کے سامنے شاہانہ سواری لائی گئی جو نہایت شاندار اور مزین تھی، مگر انھوں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ میرا جانور میرے لیے زیادہ ٹھیک ہے (دابتی اوفق لی)

حضرت عمر بن عبد العزیز شوریٰ کے اصول پر نہایت شدت کے ساتھ قائم تھے۔ خلافت

کے عہدہ پر ان کا تقرر سابق خلیفہ کی وصیت کے تحت ہوا تھا۔ مگر انھوں نے اس کو کافی نہیں سمجھا۔ اس سلسلہ میں تاریخ کا بیان ہے :

وجمع الناس فی المسجد، وکان من قولہ لھم : اِنّی قد خلعتُ ما فی اَعْنَاقِکم مِن بَیْعَتی، فَاخْتَارُوا لِاَنْفُسِکُمْ۔ فصاحَ الناسُ صیحۃً واحدۃً : قَد اَخْتَرْنَاکَ یا امیر المومنین۔

عمر بن عبد العزیز نے تقرری کے بعد لوگوں کو دمشق کی جامع مسجد میں جمع کیا۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ میری بیعت کا قلادہ جو تمہاری گردن میں تھا اس کو میں نے اتار دیا۔ پس تم خود اپنے لیے کسی کو پسند کر کے خلیفہ بنالو۔ یہ سن کر تمام لوگ ایک آواز چیخ اٹھے : اے امیر المومنین ہم آپ ہی کو منتخب کرتے ہیں۔

سابق خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کے انتقال کے بعد لوگ مسجد میں جمع کیے گیے۔ رَجاء بن حَیوَہ نے سلیمان بن عبد الملک کا وہ وصیت نامہ پڑھ کر سنایا جس میں عمر بن عبد العزیز کو خلیفہ نامزد کیا گیا تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کا حال اس وقت یہ تھا کہ وہ خلافت کے لیے اپنا نام سن کر اِنا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ رہے تھے۔ اس تحریر کو سن کر وہ اپنی جگہ پر بیٹھے رہ گیے۔ ایک شخص نے ہاتھ پکڑ کر انھیں اٹھایا اور لے جاکر منبر پر بٹھایا۔ اس کے بعد خلافت کی بیعت ہوئی۔ جب آپ بیعت سے فارغ ہوکر گھر واپس آئے تو آپ کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔

خلافت کے بعد آپ کی خدمت میں سواری کے لیے شاہی گھوڑے پیش کیے گیے تو آپ نے فرمایا : میرا جانور میرے لیے زیادہ بہتر ہے (دابتی اوفق لی) اسی طرح آپ سے کہا گیا کہ شاہی محل میں قیام کریں۔ آپ نے فرمایا کہ میرا خیمہ میرے لیے کافی ہے (فی فسطاطی کفایۃ)

سلیمان بن عبد الملک کا ایک بھتیجا عبد العزیز بن ولید بن عبد الملک تھا۔ سلیمان بن عبد الملک کی وفات کے وقت وہ دار الخلافہ سے باہر تھا۔ اس کو عمر بن عبد العزیز کی بیعت کا حال معلوم نہ ہوسکا تھا۔ چنانچہ اس نے سلیمان کی وفات کی خبر سن کر خلافت کا دعوی کر دیا اور اپنی فوج لے کر دمشق کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب وہ دمشق پہنچا اور اس کو معلوم ہوا کہ عمر بن عبد العزیز کے

ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہوئی ہے تو بلا تاخیر وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی۔

عبدالعزیز بن ولید نے کہا کہ مجھ کو آپ کی بیعت کا حال معلوم نہ تھا، ورنہ میں اپنی خلافت کا اعلان نہ کرتا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا کہ اگر تم خلافت کے لیے کھڑے ہو جاتے تو میں ہرگز تمہارے مقابلہ پر نہ آتا بلکہ اس سے الگ ہو کر اپنے گھر میں بیٹھ جاتا۔ عبدالعزیز بن ولید نے کہا کہ خدا کی قسم آپ کی موجودگی میں کسی اور کو میں خلافت کا مستحق نہیں سمجھتا۔

مسلمانوں میں انتہا پسند خوارج کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ حضرت علی کے زمانہ سے ہر حکمراں کے خلاف جنگ چھیڑے رہتا تھا۔ مگر جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو خوارج نے حکومت سے لڑائی ختم کر دی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم ایسے صالح آدمی سے جنگ کریں (ما ینبغی لنا أن نقاتل هذا الرجل)

عمر بن عبدالعزیز ابتدا سے ایک حق پرست اور با اصول آدمی تھے۔ خلافت سے پہلے وہ مدینہ کے امیر تھے۔ ان کو حجاج بن یوسف کے ظلم کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اس کی شکایت لکھ کر خلیفہ کے نام روانہ کی۔ مگر حجاج خلیفہ کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ حجاج کی معزولی تو نہیں ہوئی۔ البتہ اس شکایت کی بنا پر خود عمر بن عبدالعزیز امارت مدینہ سے معزول کر دیئے گیے۔ یہ واقعہ ۹۳ ھ کا ہے۔

خراسان کے عامل جراح بن عبداللہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو لکھا کہ اہل خراسان بہت ناہموار لوگ ہیں، وہ تلوار کے بغیر سیدھے نہیں ہوں گے۔ اس لیے ان کے خلاف تلوار کے استعمال کی اجازت دی جائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب میں لکھا کہ تم جھوٹ کہتے ہو کہ اہل خراسان تلوار کے بغیر درست نہ ہوں گے۔ انصاف کرنا اور حق دار کو اس کا حق پہنچانا وہ چیزیں ہیں جو ہر ایک کو درست کر دیتی ہیں۔ اس لیے تم ان کے درمیان انھیں دونوں چیزوں کی اشاعت کرو۔

وقت کے تمام علماء نے آپ کے غیر معمولی علم کی گواہی دی ہے۔ مجاہد کا قول ہے کہ ہم عمر بن عبدالعزیز کے پاس اس خیال سے آئے کہ وہ ہم سے کچھ سیکھیں گے، مگر ان کے پاس آنے کے بعد ہمیں خود ان سے سیکھنا پڑا ——— اس سے مراد کتابی علم نہیں، بلکہ وہ علم ہے جو

خشیتِ خداوندی (فاطر ۲۸) سے پیدا ہوتا ہے۔ کتابی علم کی ایک حد ہے، مگر خشیت کے ذریعہ ملنے والے علم کی کوئی حد نہیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کا دینی مقام اتنا بلند ہے کہ وہ عمر ثانی کہے جاتے ہیں۔ ان کے مخالفین تک ان کی عظمت اور پاکبازی کا اعتراف کرتے تھے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ بنوامیہ میں وہ واحد شخص تھے جن کا احترام بعد کو آنے والے بنوعباس کرتے تھے، حتی کہ وہ شیعوں کے درمیان بھی انتہائی محترم سمجھے جاتے تھے جو دوسرے مسلمانوں سے الگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد علی کی پیروی کرتے ہیں:

He, alone of the Umayyads, was respected by the later Abbasid dynasty, and was highly regarded even among the Shi'ites, schismatic followers of Muhammad's son-in-law Ali (X/248).

جراح بن عبد اللہ اسلمی خراسان کے عامل (گورنر) تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کے پاس شکایت پہنچی کہ اہل ذمہ میں سے جو لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں، جراح بن عبد اللہ ان سے بھی جزیہ وصول کرتے ہیں۔ آپ نے فوراً جراح بن عبد اللہ کے پاس یہ حکم بھیجا کہ جو شخص نماز پڑھتا ہو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے۔ اس خبر کو سننے کے بعد لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہونے لگے۔

جراح بن عبد اللہ نے حضرت عمر بن عبد العزیز سے کہا کہ اگر ایسی پالیسی اختیار کی گئی تو ہماری آمدنی بہت کم ہو جائے گی اور حکومت کو سخت مالی نقصان ہوگا۔ آپ نے فرمایا: تمہارا برا ہو، محمدؐ ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے نہ کہ مال گزاری وصول کرنے کے لیے (ویحك إنّ محمداً بُعث هادياً ولم يُبعث جابياً)

زندہ یا مردہ

گاڑی کے چلنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو ایک ڈرائیور چلائے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے انجن کو چلا کر اس کو سڑک پر چھوڑ دیا جائے۔ بظاہر دونوں گاڑی چلتی ہوئی نظر آئے گی۔ مگر دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ ڈرائیور والی گاڑی چل کر اپنی منزل پر پہنچتی ہے۔ مگر بے ڈرائیور گاڑی کا انجام صرف یہ ہے کہ وہ کچھ دیر تک دوڑے اور اس کے بعد کسی چیز سے ٹکرا کر ختم ہو جائے۔

ایک باہوش ڈرائیور جب گاڑی کو چلاتا ہے تو وہ راستہ کو دیکھتا ہوا گاڑی چلاتا ہے۔ ضرورت کے مطابق وہ کبھی چلتا ہے اور کبھی رک جاتا ہے۔ کبھی آگے بڑھتا ہے اور کبھی پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ کبھی سیدھے چلتا ہے اور کبھی دائیں یا بائیں کی طرف مڑ جاتا ہے۔ یہی وہ گاڑی ہے جو کامیابی کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچتی ہے۔

اس کے برعکس جو گاڑی ڈرائیور کے بغیر دوڑ رہی ہو وہ بس یک طرفہ طور پر دوڑتی رہے گی۔ اس گاڑی کے ساتھ عقل اور شعور شامل نہیں۔ وہ نہ رکے گی اور نہ پیچھے ہٹے گی۔ وہ نہ کہیں مڑے گی اور نہ کبھی سست ہوگی۔ وہ اندھا دھند بس آگے کی طرف دوڑتی رہے گی۔ ایسی گاڑی کا واحد انجام یہ ہے کہ وہ تھوڑی دور چلے اور اس کے بعد ٹکرا کر اپنا خاتمہ کرلے۔

اس مثال سے زندہ انسان اور مردہ انسان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ زندہ انسان باہوش انسان ہے اور مردہ انسان بے ہوش اور بے عقل انسان۔ زندہ انسان اگر کسی وقت بولے گا تو حسب موقع چپ بھی ہو جائے گا۔ وہ اگر چلے گا تو کبھی رک بھی جائے گا۔ وہ اگر آگے بڑھے گا تو حالات کو دیکھ کر پیچھے بھی ہٹ جائے گا۔ وہ اگر تیز دوڑے گا تو کبھی اپنی رفتار سست بھی کرلے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی کامیابی تک پہنچ جائے گا ——— اس کے برعکس مردہ انسان وہ ہے جو اس قسم کی سمجھ سے خالی ہو۔ جو بولنے کے بعد چپ نہ ہو سکے۔ جو چلنے کے بعد رکنا نہ جانے۔ جو صرف اپنی شرطوں کو منوانا جانتا ہو۔ فریق مخالف کی شرطوں پر راضی ہونا اس کے یہاں خارج از بحث ہو۔ ایسا انسان مردہ انسان ہے۔ خدا کی دنیا میں اس کے لیے صرف یہ مقدر ہے کہ وہ تباہی اور بربادی کا نشان بن کر رہ جائے۔

قرآنی نظریہ سزا کا اعتراف

ٹائمس آف انڈیا (۳۰ جون ۱۹۸۷) نے امریکی خبر رساں ایجنسی اے ایف پی کے حوالہ سے ایک خبر شائع کی ہے۔ اس کے مطابق ٹکساس کے اٹارنی جنرل جم میڈاکس نے اپیل کی ہے کہ ان کی ریاست میں سزائے موت کے واقعات کو فلمایا جائے تاکہ عوام دیکھیں کہ کس طرح ایک مجرم کو موت کی سزا دی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ موت کی (موجودہ) سزائیں معمول کی چیز بن گئی ہیں۔ انھوں نے اپنی مانع جرم حیثیت کھو دی ہے۔ ریاست ٹکساس نے ۱۹۸۲ سے اب تک ۲۸ قیدیوں کو سزائے موت دی ہے۔ یہ سب سزائیں مہلک انجکشن کے ذریعہ دی گئیں۔ سزائے موت کا یہ سلسلہ امریکی سپریم کورٹ کے ایک فیصلہ کے بعد شروع ہوا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ ریاستوں کو چاہیے کہ وہ موت کی سزا کو دوبارہ شروع کریں۔ اس سے پہلے امریکہ میں سزائے موت کو یہ کہہ کر بند کر دیا گیا تھا کہ وہ سزا کا بے رحمانہ طریقہ ہے:

FILMING EXECUTIONS: Texas Attorney General Jim Maddox is calling for executions in his state to be filmed so the public can see how a criminal is put to death, reports AFP from Huntsville, Texas. He says executions have become so routine that their deterrent purpose is being lost. Texas has executed 28 prisoners — all by lethal injection — since 1982, after a supreme court ruling allowing states to reintroduce capital punishment, earlier banned as a 'cruel and unusual punishment' (p. 7).

امریکہ میں سزائے موت کو بے رحمانہ قرار دے کر اسے بند کر دیا گیا تھا۔ مگر اس کے بعد جرائم میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۸۲ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے تحت اسے دوبارہ کھولا گیا۔ تاہم اب بھی مجرم کو موت کی سزا دینے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ یہ تھا کہ اسے بے ہوش کر کے مہلک انجکشن دیا جائے، اور پھر خاموشی سے اس کو دفن کر دیا جائے۔

ایسی حالت میں سزائے موت صرف ایک خبر تھی نہ کہ عوامی سبق۔ اب امریکہ کے مدبرین کو احساس ہوا کہ سزائے موت کو عوامی مشاہدہ میں بھی آنا چاہیے تاکہ وہ دوسروں کو جرم سے روکنے کا سبب بن سکے۔ حتی کہ وہ چاہتے ہیں کہ سزائے موت کے عمل کو فلم پر ریکارڈ کیا جائے اور اس کو ٹیلی وژن پر دکھا کر تمام لوگوں کے لیے عبرت کا سامان بنا دیا جائے۔

ہر ایک کی کہانی

فیجی ایک چھوٹا سا ملک ہے جو بحر الکاہل کے جنوبی حصہ میں واقع ہے۔ ۱۹۷۰ میں وہ برطانی قبضہ سے آزاد ہوا۔ اس کی راجدھانی سوا (Suva) ہے۔ یہاں تقریباً ۵۰ فی صد ہندستانی نسل کے لوگ ہیں جو کہ برطانی قبضہ کے دور میں ہندستان سے جاکر وہاں آباد ہوئے۔

۱۱ اپریل ۱۹۸۷ کو فیجی میں الکشن ہوا۔ اس الکشن کے نتیجہ میں وہاں نئی حکومت بنی۔ اس حکومت کے وزیر اعظم تموکی باودرا (Timoci Bavadra) تھے۔ نئی حکومت میں چوں کہ ہندستانی نسل کے لوگوں کا غلبہ تھا، فیجی نسل کے لوگوں نے اس کے خلاف مظاہرے کیے۔ انھوں نے اس کو فیجی میں چھوٹا ہندستان (Little India) قائم کرنے کا نام دیا۔ اس کے جواب میں وزیر اعظم باودرا نے نہایت پر اعتماد بیان دیا۔ انھوں نے کہا:

I am in control. I will remain in control.

معاملات پوری طرح میرے قبضہ میں ہیں اور وہ بدستور میرے قبضہ میں رہیں گے (ٹائمس آف انڈیا ۱۵ مئی ۱۹۸۷) مگر اس اعلان کے صرف چند دن بعد ۱۴ مئی ۱۹۸۷ کو فیجی میں فوجی انقلاب آگیا۔ ۳۸ سالہ لفٹنٹ کرنل رابوکا (Sitiveni Rabuka) دس مسلح فوجیوں کے ساتھ پارلیمنٹ ہاؤس میں داخل ہوئے اور منتخب وزیر اعظم کو ان کے ۲۷ ساتھیوں سمیت گرفتار کرلیا اور ایک ٹرک پر بٹھا کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ کر دیا۔ کرنل رابوکا نے ۷ سالہ دستور کو معطل کر دیا اور خود اپنے بنائے ہوئے دستور کے مطابق فیجی پر اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔

وزیر اعظم تموکی باودرا کی کہانی ہر انسان کی کہانی ہے۔ جس آدمی کو بھی یہاں کچھ مواقع ملتے ہیں وہ سمجھ لیتا ہے کہ سب کچھ میرے قبضہ میں ہے، کوئی مجھے بے دخل کرنے والا نہیں۔ مگر جلد ہی خدا کا قانون ظاہر ہوتا ہے اور وہ تنکے کی طرح نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس دنیا میں ہر روز ہو رہا ہے۔ مگر ہر آدمی اس کو صرف اخبار کی خبر سمجھتا ہے، کوئی نہیں جو اس کو اپنی زندگی کی خبر سمجھے۔

زندگی کا سفر

انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کی تربیت مصائب کی درس گاہ میں ہوتی ہے۔ اور دوسرے وہ جن کی تربیت آسانیوں کی درس گاہ میں ہوتی ہے۔ بظاہر آسانیوں میں پرورش پانا اچھی بات ہے۔ مگر وہ چیز جس کو انسان سازی کہتے ہیں، اس کی حقیقی جگہ صرف مصائب کی درسگاہ ہے نہ کہ آسانیوں کی درس گاہ۔ کسی کا یہ قول نہایت درست ہے کہ سہولت نہیں بلکہ جدوجہد، آسانی نہیں بلکہ مشکل وہ چیز ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے:

It is not ease but effort,
not facility but difficulty
that makes men.

زندگی کے سیلاب میں بے شمار لوگ مصیبتوں کی زد میں آتے ہیں۔ مگر مشاہدہ بتاتا ہے کہ عام طور پر لوگوں کا انجام دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ لوگ جو مصیبتوں کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں پاتے اور مایوسی اور دل شکستگی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو مضبوط اعصاب والے ثابت ہوتے ہیں۔ وہ مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں اور آخر کار اپنے لیے ایک زندگی بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

تاہم دوسرے گروہ کو یہ کامیابی ہمیشہ ایک محرومی کی قیمت پر ملتی ہے۔ مادی تجربات انھیں فکر کے اعتبار سے بھی مادی بنا دیتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ مادی چیزوں سے محرومی نے انھیں ماحول میں بے قیمت کر دیا تھا اور جب انھوں نے مادی چیزوں کو پالیا تو اسی ماحول میں وہ دوبارہ قیمت والے ہو گیے۔ اس تجربہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سراسر مادہ پرست انسان بن جاتے ہیں۔ وہ مادی چیزوں کے کھونے کو کھونا سمجھنے لگتے ہیں اور مادی چیزوں کے پانے کو پانا۔

مصیبتوں میں پڑنے کا اصل فائدہ سبق اور نصیحت ہے۔ مگر یہ فائدہ صرف اس وقت ملتا ہے جب کہ آدمی مصیبتوں کی زد میں آئے مگر وہ ہلاک نہ ہو۔ وہ زندگی کی تلخیوں سے دوچار ہو مگر وہ ان سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔ مصیبتیں اور تلخیاں اس کے لیے تجربہ ثابت ہوں نہ کہ وہ اس کے ذہن کی معمار بن جائیں۔

ممکن اور ناممکن

سابق وزیر اعظم ہند لال بہادر شاستری جنوری ۱۹۶۶ میں انتقال کر گیے۔ اس کے بعد کانگریس پارٹی نے مسز اندرا گاندھی کو وزیر اعظم بنایا۔ تاہم مرارجی ڈیسائی سے ان کی کش مکش جاری رہی۔ کیوں کہ وہ خود وزیر اعظم بننا چاہتے تھے۔ ۱۹۶۷ کے الکشن کے بعد مرارجی ڈیسائی کو نائب وزیر اعظم بنایا گیا۔

مگر مرارجی ڈیسائی نائب وزیر اعظم کے عہدہ کو اپنے لیے کمتر سمجھتے تھے۔ چنانچہ کش مکش بدستور جاری رہی۔ سابق وزیر اطلاعات مسٹر اندر کمار گجرال نے لکھا ہے کہ ۱۹۶۹ میں مسز اندرا گاندھی نے ان کے ذریعہ مرارجی ڈیسائی کو یہ پیش کش کی کہ ان کو مزید اعزاز دے کر راشٹرپتی (پریسیڈنٹ) کا عہدہ دیدیا جائے۔ مسٹر گجرال کا بیان ہے کہ جب انھوں نے یہ پیش کش مرارجی ڈیسائی کے سامنے رکھی تو بلا تاخیر ان کا جواب یہ تھا :

Why not she herself?

اندرا گاندھی خود کیوں نہیں (ٹائمس آف انڈیا ۱۲ جولائی ۱۹۸۷) یعنی اندرا گاندھی خود پریسیڈنٹ بن جائیں اور مجھے وزیر اعظم بنا دیں۔ واقعات بتاتے ہیں کہ مرارجی ڈیسائی کانگریس سے الگ ہو گیے۔ انھوں نے وزیر اعظم بننے کے لیے سارے ملک کو اُلٹ پلٹ ڈالا۔ مارچ ۱۹۷۷ کے الکشن میں جنتا پارٹی کی جیت کے بعد وہ مختصر مدت کے لیے وزیر اعظم بن بھی گیے۔ مگر جلد ہی بعد وہ سیاسی زوال سے دوچار ہوئے اور پھر کبھی ابھر نہ سکے۔

مرارجی ڈیسائی کی سیاسی ناکامی کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ ممکن کو چھوڑ کر ناممکن کی طرف دوڑے۔ اگر وہ اس راز کو جانتے کہ موجودہ حالات میں ان کے لیے جو آخری ممکن چیز ہے وہ صدارت ہے نہ کہ وزارتِ عظمیٰ، تو یقیناً وہ ذلت اور ناکامی سے بچ جاتے۔ مگر ناممکن کے پیچھے دوڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ممکن سے بھی محروم ہو کر رہ گیے۔

ناممکن کے پیچھے دوڑنا، آدمی کو ممکن سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ جب کہ ممکن پر قانع ہونے والا ممکن کو بھی پاتا ہے اور بالآخر ناممکن کو بھی۔

معذوری کے باوجود

میں نے ۱۹۸۲ میں اپنا پاؤں کھو دیا تھا۔ اور اسی وقت سے میں دنیا کے گرد سمندری سفر کرتا رہا ہوں۔ یہ بات ٹرسٹن جونز نے تھائی لینڈ کے معذور بچوں کے ایک گروپ سے بینکاک میں کہی۔ وہ ایک ملاح اور مصنف اور مہم جو ہیں۔ ان کا پیغام بہت واضح تھا: آپ یہ انتظار نہ کریں کہ دوسرے لوگ آپ کی مدد کریں۔ آپ کو اپنی مدد آپ کرنے کا فن سیکھنا چاہیے اور خود اپنے طریقہ پر کام کرنا چاہیے، بارئیش کیپٹن نے کہا۔ ۵۳ سالہ جونز ۱۹۵۲ سے اپنے طریقہ پر غیر معمولی کام کرتے رہے ہیں جب کہ وہ برطانیہ کے شاہی بحریہ سے یہ کہہ کر الگ کر دیئے گئے تھے کہ وہ جسمانی طور پر سمندر کے لیے غیر موزوں ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران فوجی ڈیوٹی کرتے ہوئے ان کے ایک پاؤں کو زخم لگا تھا۔ یہ حادثہ بالآخر انھیں معذور قرار دینے تک پہنچا اور ۱۹۸۲ میں ان کا بایاں پاؤں گھٹنے کے اوپر سے کاٹ دیا گیا۔ ۱۹۵۳ سے مسٹر جونز دنیا کے سامنے یہ ثابت کرتے رہے ہیں کہ وہ کچھ اور ہو سکتے ہیں مگر وہ جسمانی طور پر سمندر کے لیے غیر موزوں ہرگز نہیں۔ پچھلے ۳۴ سالوں میں انھوں نے ۶ لاکھ ۴۰ ہزار کیلومیٹر کا بحری سفر کیا ہے۔ انھوں نے بیس بار اٹلانٹک سمندر کو پار کیا ہے اور کرہ ارض کے گرد تین بحری سفر مکمل کیے ہیں:

"I lost my leg in 1982 and have been sailing around the world ever since," Tristan Jones — sailor, author and adventurer — told a group of handicapped Thai children in Bangkok, reports DPA. The message was clear, "You must not wait for people to help you. You must learn to help yourself and must do things your own way," the bearded Welsh captain said. Jones, 53, has been doing extraordinary things his own way since 1952 when he was discharged from Britain's Royal Navy for being "physically unfit for sea." He had received a leg wound in active duty during World War II that eventually led to his invalid status and in 1982 resulted in the amputation of his left leg, above the knee. Since 1953 Jones has been proving to the world that he is anything but "physically unfit for sea." In the past 34 years he has sailed 640,000 kms (all in craft under 40 feet), made 20 trans-Atlantic ocean crossings (nine single-handed) and circumnavigated the world three times.

The Times of India (New Delhi) August 18, 1987

منفی عمل

ایک مغربی مصنف نے کہا کہ ہر بار جب میں حقیقت کے لیے اپنا دروازہ بند کرتا ہوں تو وہ کھڑکی کے راستے سے میرے گھر کے اندر داخل ہوجاتی ہے:

Every time I close the door on reality,
it comes in through the window.
— Ashleigh Brilliant

یہ بہت بامعنی قول ہے۔ حقیقت کی مثال سیلاب کی سی ہوتی ہے۔ اگر کوئی بند ٹوٹ جائے اور سیلاب کا دھارا آپ کے گھر کی طرف رخ کرے تو آپ اپنا دروازہ بند کرکے اس سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اگر آپ نے سامنے کا دروازہ بند کیا تو وہ پیچھے کے دروازہ سے آپ کے گھر کے اندر داخل ہوجائے گا، حتی کہ اگر آپ اپنے تمام دروازے اور تمام کھڑکیاں بند کرلیں تو وہ دیوار کو توڑ کر آپ کے گھر میں گھس پڑے گا۔ اس قسم کی کوئی تدبیر سیلاب کو روکنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان مکمل طور پر اس کے مصداق ثابت ہوئے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں حقائق کا ایک نیا طوفان اٹھا۔ اس نے مسلمانوں کے ملی وجود کو ہر طرف سے چیلنج کرنا شروع کیا۔ مگر مسلمانوں نے اپنے "دروازوں" اور "کھڑکیوں" کو بند کرکے سمجھا کہ وہ طوفان کی زد سے محفوظ ہوگیے ہیں۔ انھوں نے غیر جانبدارانہ طور پر مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ یہ سوچ کر مطمئن ہوگیے کہ "ہم نے" تو بحر ظلمات میں اپنے گھوڑے دوڑا دیئے ہیں اور آندھیوں سے کہہ دیا ہے کہ تم اپنا راستہ دوسری طرف تلاش کرلو۔ پھر یہ طوفان ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ مگر یہ خوش فہمیاں ہمارے کچھ کام نہ آئیں۔ سیلاب اس طرح ہمارے ٹھکانوں میں گھسا کہ وہ آخری متاع تک بہالے گیا۔

مسلمانوں کے لیے تعمیر نو کا آغاز یہ ہے کہ وہ کھلے دل سے اپنے پچھڑے پن کا اعتراف کریں، جب تک وہ اس کا اعتراف نہ کریں وہ اپنی منزل کی طرف کوئی حقیقی سفر شروع نہیں کرسکتے۔

ذہنیت کا فرق

۴ نومبر ۱۹۸۷ کو لاہور میں پاکستان اور آسٹریلیا کے درمیان ریلائنس کپ کے لیے کرکٹ میچ تھا۔ اس میچ میں پاکستان کی ٹیم ہار گئی۔ یہ خبر بہت سے پاکستانیوں کے لیے اتنی سخت ثابت ہوئی کہ ان پر دل کا دورہ پڑ گیا۔ حتی کہ بعض افراد اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکے اور حرکتِ قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال کر گیے (ٹائمس آف انڈیا ۸ نومبر ۱۹۸۷)

یہی بات ہندستان میں اس وقت پیش آئی جب کہ اگلے دن ۵ نومبر کو بمبئی میں انگلینڈ کے مقابلہ میں ہندستان کی ٹیم ہار گئی۔ ہندستان میں کسی کے حرکت قلب بند ہونے کی اطلاع تو نہیں آئی۔ البتہ ایک اور شکل میں یہاں بھی موتیں واقع ہوئیں۔ دونوں طرف کے پرستاروں کے درمیان ایک سے زیادہ مقامات پر ٹکراؤ ہو گیا۔ اور وہ ناخوش گوار چیز پیش آئی جس کو ہندستان ٹائمس (۶ نومبر ۱۹۸۷) نے بجا طور پر میچ فسادات (Match riots) کا نام دیا ہے۔

۹ نومبر کی ایک ملاقات میں اس کا ذکر مسٹر شکیل احمد خاں (پیدائش ۱۹۴۰) سے ہوا۔ انھوں نے انجینیرنگ کی تعلیم حاصل کی ہے، اور آج کل عرب امارات کی ایک فرم میں چیف انجینیر ہیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اس معاملہ میں میرا طریقہ بالکل الگ ہے۔ میں کبھی شکست کے احساس سے دوچار نہیں ہوتا۔ کیوں کہ جیتنے والی ٹیم کو میں اپنی ٹیم سمجھتا ہوں:

I never lose, winning team is my team.

یہی وہ چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں اسپورٹس مین شپ (Sportsmanship) کہا جاتا ہے۔ باعتبار مفہوم اس کو ہنر پسندی کہہ سکتے ہیں۔ یہ صحت مند ذہن کی علامت ہے۔ اس ذہن کے مطابق اصل چیز کھیل ہے نہ کہ کھیلنے والا۔ صحیح اسپورٹسمین اسپرٹ یہ ہے کہ آدمی کی نگاہ ہنر پر ہو۔ وہ یہ دیکھے کہ کھیل کیسا کھیلا گیا۔ نہ یہ کہ کون شخص کھیلا۔

۱۹۴۷ کے "انقلاب" کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہندستان اور پاکستان میں اس صحت مند مزاج کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ یہاں کے لوگ ہنر مندی سے محظوظ نہیں ہو پاتے۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ جیتنے والا کون ہے اور ہارنے والا کون۔ اپنی قوم کا آدمی جیتے تو وہ خوشی مناتے

ہیں، اور اگر اتفاق سے دوسری قوم کا آدمی جیت جائے تو غم سے نڈھال ہو جاتے ہیں۔

یہ صحت مند ذہنیت نہیں، یہ مریضانہ ذہنیت ہے۔ جن لوگوں کا یہ مزاج ہو وہ کبھی کوئی اعلیٰ کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کے اندر قومی خود غرضی تو خوب ترقی کرے گی، مگر ان کے درمیان سائنٹفک مزاج کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ وہ مزاج جس کا ایک نمونہ موجودہ زمانہ میں جاپان نے پیش کیا ہے۔ یعنی یہ کہ آدمی قوم پسند یا فرقہ پسند نہ ہو بلکہ وہ معیار پسند ہو۔ جن لوگوں کے اندر یہ صفت ہو، وہ جب کوئی کام کرتے ہیں تو ان کی ساری توجہ معیار (Quality) پر ہوتی ہے۔ وہ اپنا کام اس طرح کرتے ہیں کہ اس کے بارے میں وہ اعلیٰ معیار سے کم تر کسی چیز پر راضی نہیں ہوتے۔

جاپانیوں کی یہی خصوصیت ہے جس کی بنا پر ان کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ اپنی مصنوعات کو نقص بدرجہ صفر (Zero-defect) کے درجہ تک پہونچا سکیں۔ اور اپنے بڑھے ہوئے معیار کی بنا پر ساری دنیا کی مارکیٹ پر قبضہ کر لیں۔

اسرائیل کے قیام سے پہلے کی بات ہے، ایک مسلم پہلوان اور ایک یہودی پہلوان میں کشتی کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں مسلمان کامیاب رہا۔ اس نے یہودی پہلوان کو منٹوں کے اندر گرا دیا۔ بظاہر یہودی پہلوان کے لیے یہ بڑی ذلت کی بات تھی۔ مگر اس نے فوراً اٹھ کر مسلم پہلوان کو گلے سے لگا لیا۔ اس نے کہا: میں تمہاری ذات کی نہیں بلکہ تمہارے فن کی قدر کرتا ہوں۔ تم نے جس فن کاری کے ساتھ مجھے گرایا ہے وہ اتنا اعلیٰ ہے کہ میں نے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

کسی قوم میں اسپورٹسمین اسپرٹ کا ہونا یا نہ ہونا کوئی جزئی بات نہیں۔ اس کا تعلق اس قوم کے پورے کردار سے ہے۔ اس کا ظہور زندگی کے تمام معاملات میں ہوتا ہے۔ ایک نوعیت کا ذہن آدمی کو اپنے حریف سے صرف نفرت کرنا سکھاتا ہے۔ حریف کی خوبیاں بھی اس کو برائی کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ یہ چیز اس کو ہر اعتبار سے پست کردار بنا دیتی ہے۔ اس کے برعکس دوسرا مزاج آدمی کو معیار پسند بناتا ہے اس سے آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے اندر ایک ایسا انسان ابھرتا ہے جس کے لیے دشمن کا عمل بھی مفید سبق حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے۔

سب سے بڑی بھول

ڈِک شان (Dick Shawn) ایک امریکی ایکٹر تھا۔ وہ فلم میں اور اسٹیج پر ہنسانے کا کردار ادا کرتا تھا۔ ۱۷ اپریل ۱۹۸۷ کی رات کو وہ کیلی فورنیا کے مقام لاجولا (La Jolla) میں ایک تھیٹر ہال کے اندر ایکٹنگ کر رہا تھا اور اپنی تفریحی باتوں سے لوگوں کو ہنسا رہا تھا۔ ہال کے اندر چھ سو تماشائی بیٹھے ہوئے اس کی تفریحی باتوں سے لطف لے رہے تھے۔ اس کی ایکٹنگ جاری تھی کہ اچانک وہ اسٹیج پر منھ کے بل گر پڑا۔ لوگوں نے سمجھا کہ یہ کوئی مذاق ہے جو اس نے اپنی ایکٹنگ کے جزء کے طور پر کیا ہے :

People thought it was a joke, part of the act.

ایکٹر اسی حال میں چند منٹ تک فرش پر پڑا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے لڑکے ایڈم (Adam) کو شبہہ ہوا۔ اس نے ایک ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے آکر دیکھا اور فوراً اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔ ایمبولنس کے ذریعہ اس کو اسپتال پہنچایا گیا۔ اسپتال کے ڈاکٹروں نے جانچ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ ڈِک شان کا انتقال ہو چکا ہے۔ انتقال کا سبب غالباً دل کا دورہ (Heart attack) تھا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۵۷ سال تھی (ٹائمس آف انڈیا ۲۰ اپریل ۱۹۸۷)

اس دنیا میں کوئی شخص روتے ہوئے مرجاتا ہے اور کوئی شخص ہنستے ہوئے۔ کسی پر اس کی موت بدحالی میں آجاتی ہے اور کسی پر خوش حالی میں۔ کوئی خاک پر بیٹھا ہوا اس دنیا سے چلا جاتا ہے اور کوئی تخت حکومت پر۔ موت ایک ایسا انجام ہے جو ہر ایک پر آتا ہے خواہ وہ ایک حالت میں ہو یا دوسری حالت میں۔

مگر موت ہی وہ سب سے بڑی حقیقت ہے جس کو انسان سب سے زیادہ بھولا ہوا ہے یہاں رونے والا اور ہنسنے والا دونوں ایک ہی حال میں مبتلا ہیں۔ وہ صرف اپنے آج کو جانتے ہیں، وہ اپنے کل کو نہیں جانتے۔ اگر وہ اپنے کل کو جان لیں تو ہنسنے والے کا حال بھی وہی ہو جائے جو رونے والے کا حال نظر آرہا ہے۔

یہ سب سے بڑی بھول ہے جس میں آج کا انسان مبتلا ہے۔

دنیا اور آخرت

موجودہ دنیا میں حق کے پاس دلیل ہے مگر طاقت نہیں۔ آخرت کی دنیا میں حق کے پاس دلیل بھی ہوگی اور طاقت بھی ـــــ یہی ایک لفظ میں موجودہ دنیا اور آخرت کی دنیا کا خلاصہ ہے۔

اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کو آخرت کی دنیا میں عزت اور ترقی کا مقام دیا جائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حق کے سامنے اس وقت جھک گیے جب کہ وہ حق کے سامنے جھکنے کے لیے مجبور نہ تھے۔ جنھوں نے حق کا اعتراف اس وقت کیا جب کہ وہ اس کا انکار بھی کر سکتے تھے۔

موجودہ دنیا میں انسان کی سب سے بڑی خوبی اعتراف ہے۔ اپنے سے باہر جو واقعہ موجود ہے، اس کا اعتراف کسی تحفظ ذہنی کے بغیر کرنا، یہی کمالِ انسانیت ہے۔ یہی وہ بنیادی انسانی صفت ہے جس سے دوسری تمام صفاتِ انسانی پیدا ہوتی ہیں۔ جس آدمی کے اندر جتنا زیادہ اعتراف کا مادہ ہوگا، اتنا ہی زیادہ اس کی انسانیت ترقی کرے گی۔ اور کسی شخص کے اندر اعتراف کے معاملہ میں جتنی کمی ہوگی اتنا ہی وہ گراوٹ کا شکار ہوتا چلا جائے گا۔

اس اعتراف کا اظہار دو سطحوں پر ہوتا ہے۔ خدائی سطح پر، اور علمی حقائق کی سطح پر۔ مومن کے جذبہ اعتراف کا اظہار ذات خداوندی کی سطح پر ہوتا ہے جو نہ صرف سب سے بڑی حقیقت ہے بلکہ تمام حقیقتیں اسی کی مخلوق ہیں۔ غیر مومن کے جذبہ اعتراف کا اظہار ان حقائق کی سطح پر ہوتا ہے جن کا ادراک کرنے کے لیے صرف عقلی قوتوں کا اعتراف کافی ہو۔

سچا مومن خدا پرست ہوتا ہے اور سچا انسان حقیقت پرست۔ جو لوگ واقعی معنوں میں حقیقت پرست اور حقیقت پسند ہوں وہی لوگ اس امتحان کی دنیا میں ایمان (بالفاظِ دیگر، اعتراف صداقت) کی توفیق پاتے ہیں۔ جو لوگ اس ابتدائی انسانی صفت سے خالی ہوں وہ گویا حیوان ہیں جن کے اوپر انسان کا لباس اوڑھا دیا گیا ہے۔ وہ دنیا میں باعتبار حقیقت اندھے ہیں اور آخرت میں وہ باعتبار حقیقت بھی اندھے ہوں گے اور باعتبار واقعہ بھی۔

اجنبی دین

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ بدأ الاسلام غریبًا وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام اجنبی حالت میں شروع ہوا، اور وہ پھر ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ شروع ہوا تھا۔ تو ایسے اجنبیوں کو مبارکی ہو۔

وعن عمرو بن عوف قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ إنّ الدین بدأ غریبًا وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء۔ وهم الذین یُصلحون ما افسد الناسُ من بعدی من سُنّتی (رواہ الترمذی)

حضرت عمرو بن عوف کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دین شروع ہوا تو وہ اجنبی تھا، اور وہ پھر ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ شروع میں تھا۔ تو اجنبیوں کو مبارکی ہو۔ یہی لوگ ہیں جو اس بگاڑ کی اصلاح کریں گے جو میرے بعد میری سنت میں لوگ کریں گے۔

آدمی جب کوئی چیز کھاتا ہے تو اس کو اس کے مزہ کا احساس ہوتا ہے ——— نمکین، میٹھا، کھٹا، کڑوا، وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کی زبان میں مختلف قسم کے ذائقہ خانے (Taste buds) ہیں۔ کھانے کے دوران جب کوئی چیز ان ذائقہ خانوں کو چھوتی ہے تو نازک تاروں کے ذریعہ ان کی خبر دماغ تک پہنچتی ہے۔ اس طرح آدمی جان لیتا ہے کہ وہ جو چیز کھا رہا ہے اس کا ذائقہ کیا ہے۔ زبان کے یہ ذائقہ خانے اگر اپنی فطری حالت میں ہوں تو ایسے آدمی کو چیزوں کا صحیح ذائقہ (True taste) ملے گا اور اگر کوئی شخص اپنے ذائقہ خانوں کو ان کی اصلی حالت میں محفوظ نہ رکھ سکے تو اس کو غلط ذائقہ (False taste) ملنے لگے گا۔

بگاڑ کے زمانہ میں ایسا ہوتا ہے کہ خدا اور رسول والا دین گم ہو جاتا ہے اور دین کی دوسری دوسری شکلیں رائج ہو جاتی ہیں۔ مثلاً قومی دین، برکت والا دین، رسم ورواج والا دین، آبائی فخر والا دین، لوگ دین کی انھیں خود ساختہ شکلوں سے مانوس ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ خدا اور رسول والے دین کو اجنبی سمجھ کر اس کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

شیطان کی پیروی

روایات میں آتا ہے کہ ایک بار حضرت عمر فاروقؓ مدینہ کی مسجد نبوی میں آئے تو دیکھا کہ صحابہ وہاں بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ ذکر کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ اگرچہ اس بات کو بیان کرنے والے صحابہ کرام تھے اور یہ بات مسجد نبوی جیسے مقدس مقام پر بیان ہو رہی تھی، مگر حضرت عمرؓ نے اِس سے انکار کیا کہ وہ محض سُن کر اُس کو مان لیں۔ انھوں نے کہا کہ میں اس کے بارہ میں اس وقت تک کوئی رائے نہیں دے سکتا جب تک خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست دریافت نہ کر لوں۔

چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہائش گاہ پر آئے اور دروازہ پر کھڑے ہو کر آواز دی۔ آپ سے اجازت لے کر اندر داخل ہوئے اور مذکورہ خبر بیان کر کے اس کی اصل حقیقت دریافت کی۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، میں نے طلاق نہیں دی ہے۔ حضرت عمر اس کے بعد دوبارہ مسجد نبوی میں آئے اور اس کے دروازے پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عورتوں کو طلاق نہیں دی ہے۔ اس پر قرآن میں یہ آیت اتری:

وَاِذَا جَاءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا

(النساء ۸۳)

اور جب ان کو کوئی بات امن یا خوف کی پہنچتی ہے تو وہ اس کو پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر وہ اس کو رسول تک یا اپنے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے تو ان میں سے جو لوگ تحقیق کرنے والے ہیں وہ اس کی حقیقت کو جان لیتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔

آج کل فساد یا فرقہ وارانہ خبروں کے معاملہ میں تمام مسلمان اس اسلامی تعلیم کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق شاید چند مسلمان بھی اس ملک میں ایسے نہیں ہیں جو ہندو تعصب یا فرقہ وارانہ فساد کی کوئی خبر سنیں تو اس کی پوری طرح تحقیق کریں اور اس کے

تمام متعلقہ پہلوؤں کی جانچ کے بعد اپنی رائے قائم کریں۔ ہر ایک کا یہ حال ہو رہا ہے کہ ہندو یا حکومتی شعبوں کے بارے میں جو کچھ سنا اس کو مان لیا اور فوراً ہی اس کو پھیلانا شروع کر دیا۔

آج کل کسی بات کو پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ اخبارات ہیں۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کے اردو اخبارات کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی ممنوعہ عمل کی ایجنسی بن گیے ہیں۔ مسلمانوں نے آج کل بے شمار اخبارات نکال رکھے ہیں، ان اخبارات کا مشترک کاروبار یہی ہے کہ ہندو۔ مسلم مسائل سے متعلق کوئی بات پا جائیں تو فوراً اس کو بڑھا چڑھا کر چھاپیں اور اس کو زیادہ سے زیادہ سنسنی خیز بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کریں۔

صحابہ کرام سے تو اس قسم کی ایک معمولی لغزش محض وقتی طور پر ہو گئی تھی۔ اور تنبیہ کے بعد وہ فوراً پلٹ آئے۔ مگر اس ملک کے مسلمان نصف صدی سے اسی قسم کی صحافت میں گم ہیں۔ صحافت کی اس قسم کو موجودہ زمانہ میں زرد صحافت (ایلو جرنلزم) کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ایک طبقہ نے اس زرد صحافت کو نہایت نفع بخش کاروبار سمجھ کر اختیار کر رکھا ہے۔ مگر انھیں جاننا چاہیے کہ یہ عین وہی جرم ہے جس کو قرآن کی مذکورہ بالا آیت میں اتباع شیطان کہا گیا ہے۔

مذکورہ آیت میں کہا گیا ہے کہ جب کوئی اہم خبر ملے تو اس کو رسول کی طرف اور اصحابِ امر کی طرف لوٹاؤ۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ ایسی ہر خبر کو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور آپ کی چھوڑی ہوئی سنت کی روشنی میں جانچنا چاہیے، اور اسی کی روشنی میں اس کے بارہ میں اپنا رویہ متعین کرنا چاہیے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس طرح کے امور میں وہ سنتِ رسولؐ کی پابندی کریں نہ یہ کہ قومی جذبات جدھر چلنے کا تقاضا کریں اسی طرف تمام لوگ چل پڑیں۔

دوسری چیز اصحاب امر کی طرف رجوع کرنا ہے۔ اس حکم کی تعمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ مسلمانوں کے درمیان "اصحاب امر" کا وجود ہو۔ اس لیے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس کا اہتمام کریں۔ اگر بااختیار اصحاب امر موجود نہ ہوں تو رضا کارانہ بنیاد پر اپنے درمیان اصحاب امر کو وجود میں لائیں اور تمام اہم امور میں اسی اجتماعی ادارہ کے فیصلہ کی پیروی کریں نہ کہ اپنی انفرادی رائے کی۔

جن اور عملیات

عوام میں یہ عقیدہ پھیلا ہوا ہے کہ جنات انسانوں کے اوپر قابو پالیتے ہیں اور انھیں پریشان کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ بالکل لغو ہے۔ قرآن وحدیث میں اس کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں۔

قرآن سے ثابت ہے کہ شیطان جنوں میں سے ایک جن ہے (فسجدوا الا ابلیس کان من الجن ، الکہف ۵۰) اور شیطان کے بارہ میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ اس کو انسانوں کے اوپر کوئی عملی اختیار حاصل نہیں:

ان عبادی لیس لك علیهم سلطان الا من اتبعك من الغاوین (الحجر ۴۲) — جو میرے بندے ہیں، ان پر تیرا کوئی زور نہیں مگر وہ جو تیری راہ چلا بہکے ہوئے لوگوں میں سے۔

یہی بات قرآن میں دوسرے مقام پر ان الفاظ میں ہے کہ شیطان کو ان لوگوں پر کوئی اختیار نہیں جو ایمان والے ہیں اور اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ شیطان کا اختیار صرف ان لوگوں پر ہے جو اس کو اپنا دوست بنائیں (انه لیس له سلطان علی الذین آمنوا وعلی ربهم یتوکلون۔ انما سلطانه علی الذین یتولونه ، النحل)

غیر اہل ایمان پر بھی شیطان کو عملی یا جسمانی اعتبار سے کوئی اختیار نہیں۔ ان پر بھی اس کو صرف بہکانے کا اختیار ہے۔ جو لوگ معرفت حق سے خالی ہوں اور جو توہم پرستی میں مبتلا ہوں ان کو بہکانے میں شیطان کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہی اس کی آخری حد ہے۔ چنانچہ قیامت کے دن شیطان اپنے پیروؤں سے کہے گا کہ مجھے تمہارے اوپر کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ الا یہ کہ میں نے تمہیں پکارا تو تم نے میری بات سنی (وما کان لی علیکم من سلطان الا ان دعوتکم فاستجبتم لی، ابراہیم)

سورہ ابراہیم کی مذکورہ آیت (۲۲) کی تشریح علامہ ابو البرکات عبداللہ بن احمد بن محمود النسفی نے ان الفاظ میں کی ہے:

(وما کان لی علیکم من سلطان) من تسلط واقتدار (الا ان دعوتکم) لکنی دعوتکم الی الضلالة بوسوستی وتزئینی — "تمہارے اوپر مجھے سلطان نہ تھا" کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اوپر مجھے کوئی تسلط اور اقتدار حاصل نہ تھا۔ "الا یہ کہ میں نے تمہیں پکارا" یعنی میں نے

(فاستجبتم لی، فاسرعتم اجابتی)
التفسیر النسفی، الجزء الثانی، صفحہ ۲۶۰

تم کو گمراہی کی طرف وسوسہ اور تزئین کے ذریعہ بلایا۔ "تو تم نے میری پکار پر لبیک کہا" یعنی تم میری پکار پر دوڑ پڑے۔

شیطان کیا ہے، وہ ایک جن ہے۔ بلکہ وہ جنوں کا سردار ہے۔ قرآن کے مطابق اس کو انسان کے اوپر کوئی عملی یا جسمانی اختیار حاصل نہیں۔ جب قرآن کا بیان یہ ہے تو ایسے تمام خیالات باطل اور لغو ہیں جن میں یہ فرض کیا گیا ہو کہ شیطان (یا جنات) آدمی کے اوپر آتے ہیں اور وہ انسان کو جسمانی طور پر مغلوب کرکے اس کو اپنے قابو میں کر لیتے ہیں۔ شیطان (یا جنات) آدمی کو صرف بہکا سکتے ہیں، اس سے زیادہ کچھ اور کرنے پر وہ قادر نہیں۔

اسی طرح یہ خیال بھی سراسر لغو ہے کہ انسان عملیات کے ذریعہ جنوں کو مسخر کر لیتا ہے اور ان سے بڑے بڑے کام لیتا ہے۔ قرآن وحدیث کے پورے ذخیرہ میں اس قسم کے عقیدہ کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں۔ جنات کی تسخیر کا عقیدہ دراصل یہود کی خرافات ہے۔ یہ یہود سے دوسری قوموں میں بھی آگیا ہے۔ یہود نے حضرت سلیمان کے معاملہ کی غلط تشریح کرکے جن کی تسخیر اور عملیات کا فن ایجاد کیا اور اس کو بے بنیاد طور پر مذہبی حیثیت دیدی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر اور بادشاہ ہیں۔ ان کا زمانہ دسویں قبل مسیح ہے۔ انھوں نے تقریباً چالیس سال تک حکومت کی۔ ان کا پایۂ تخت یروشلم تھا۔ شام و کے علاوہ آپ کی سلطنت کے حدود ایک طرف فرات تک اور دوسری طرف مصر کی سرحد تک پھیلے ہوئے تھے۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی سلطنت (۹۳۰ - ۱۰۰۰ ق م) کا نقشہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) جلد ۱۷ صفحہ ۹۴۳ پر دیکھا جاسکتا ہے۔

قرآن کے بیان کے مطابق حضرت سلیمانؑ کو غیر معمولی طاقتیں حاصل تھیں۔ ہوا ان کے تابع تھی۔ جنات ان کے لیے مسخر کر دیئے گئے تھے۔ وہ جانوروں کی بولیاں سمجھتے تھے۔ وہ غیر معمولی واقعات ظہور میں لانے پر قادر تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ چیزیں پیغمبر کی حیثیت سے دی گئی تھیں۔ مگر یہودیوں میں ایک طبقہ پیدا ہوا جو یہ کہتا تھا کہ سلیمان جو غیر معمولی کام کرتے ہیں وہ سب جادو کے زور پر کرتے ہیں

یہ ذہن یہودیوں میں اتنا بڑھا کہ وہ حضرت سلیمان کی پیغمبری کے منکر ہو گیے۔ وہ کہنے لگے کہ سلیمان جادوگر تھے نہ کہ پیغمبر۔ چنانچہ موجودہ بائبل میں حضرت سلیمان کے بارہ میں جو باب ہے وہ نہ صرف یہ کہ آپ کو پیغمبر کی حیثیت سے پیش نہیں کرتا بلکہ اس کو پڑھ کر آپ کے کردار کے بارہ میں بھی کوئی اونچی تصویر نہیں بنتی :

لما ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیما انزل علیہ من اللہ سلیمان بن داؤد وعدّہ فیمن عدّ من المرسلین. قال من کان بالمدینۃ من الیھود الا تعجبون من محمد یزعم ان ابن داؤد کان نبیاً واللہ ما کان الا ساحراً

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۱۳۶)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ذکر کیا جو سلیمان بن داؤد کے بارہ میں آپ پر اترا تھا اور ان کو پیغمبروں میں سے شمار کیا تو مدینہ کے یہودیوں نے کہا کہ کیا تم محمد پر تعجب نہیں کرتے. ان کا گمان ہے کہ ابن داؤد نبی تھے۔ خدا کی قسم وہ تو صرف ایک جادوگر تھے۔

یہود کی تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم زمانہ میں انھوں نے جادو اور عملیات کا زبردست کاروبار پھیلا رکھا تھا۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں اس کا تفصیلی ذکر ہے، اس سلسلہ میں مقالہ نگار نے یہ الفاظ لکھے ہیں :

Adultry and sorcery have destroyed everything; the Majesty of God departed from Israel. Exorcism also flourished. The Greco-Roman world regarded the Jews as a race of Magicians.
Jewish Encyclopedia, Vol. VII, p. 255.

بدکاری اور جادو نے ہر چیز کو برباد کر دیا تھا۔ خدا کی عظمت اسرائیل سے رخصت ہو گئی تھی۔ جھاڑ پھونک بھی ان کے درمیان کثرت سے پھیلا ہوا تھا۔ یونانی اور رومی دنیا یہود کو جادوگروں کی ایک نسل سمجھنے لگی تھی۔

جادو اور عملیات کے اس کاروبار کو یقینی ثابت کرنے کے لیے انھیں کوئی حوالہ درکار تھا اور یہ حوالہ انھوں نے حضرت سلیمان کی زندگی میں دریافت کر لیا۔ حضرت سلیمان کے حیرت انگیز واقعات لوگوں کو معلوم تھے۔ یہود نے کہا کہ سلیمان یہ تمام واقعات جادوگری کے زور پر کرتے تھے نہ کہ پیغمبری کے زور پر۔

بالفاظ دیگر، یہود نے حضرت سلیمان کو پیغمبروں کی صف سے نکال کر عام انسانوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ اگر وہ انھیں پیغمبر کہتے تو ان کے غیر معمولی واقعات معجزہ قرار پاتے اور معجزہ صرف پیغمبر سے صادر ہوتا ہے۔ عام انسان معجزہ دکھانے پر قادر نہیں۔ مگر جب انھوں نے حضرت سلیمان کو ایک عام انسان قرار دیا۔ اور ان کے غیر معمولی واقعات کو جادو بتایا تو ان واقعات کا ظاہر کرنا عام آدمی کے بس کی چیز بن گیا۔ کیوں کہ جادو کے کرشمے عام انسان دکھاتا ہے، اس کے لیے پیغمبر ہونے کی ضرورت نہیں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد کچھ مفاد پرست یہودیوں نے یہ کیا کہ جھوٹے قصے کہانیاں بنا کر انھوں نے مشہور کیا کہ حضرت سلیمان جو غیر معمولی کارنامے کرتے تھے وہ کوئی پیغمبری کا معاملہ نہ تھا، وہ جادو کا معاملہ تھا۔ پیغمبر کا معجزہ صرف پیغمبر کے لیے خاص ہوتا ہے۔ وہ ایک استثنائی واقعہ ہوتا ہے جس کو دوسرا عام آدمی دہرا نہیں سکتا۔ اس لیے انھوں نے آپ کے کارناموں کو معجزہ کے بجائے جادو بتایا تاکہ اس کے نام پر اپنا عملیاتی کاروبار جاری کر سکیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

واتبعوا ما تتلوا الشیاطین علیٰ ملک سلیمان وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا یعلمون الناس السحر (البقرہ ۱۰۲)

(یہود کے ایک گروہ نے آسمانی کتاب پس پشت ڈال دی) وہ اس چیز کے پیرو بن گیے جو شیاطین سلیمان کی بادشاہت پر پڑھتے تھے۔ اور سلیمان نے کفر نہیں کیا بلکہ شیاطین نے کفر کیا۔ وہ لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے تھے۔

اس آیت میں کفر سے مراد سحر ہے جیسا کہ آیت کا اگلا ٹکڑا واضح کر رہا ہے۔ سحر کو کفر اس کی شناعت کی بنیاد پر کہہ دیا۔ جیسے کوئی نوجوان جھوٹ بولے تو کوئی شخص کہے: یہ تم نے کیا شیطانی کی، ایسی شیطانی تو تمہارے باپ نے کبھی نہیں کی تھی۔ حضرت سلیمان کی وفات کے بعد یہودیوں نے آپ کی طرف منسوب کر کے سحر اور عملیات کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اسی کی بابت فرمایا گیا کہ تم یہ جو سلیمان کی طرف منسوب کر کے کر رہے ہو یہ صرف تمہاری سرکشی ہے ورنہ سلیمان کا تعلق اس قسم کے جادو اور عملیات سے ہرگز نہ تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام پیغمبر تھے۔ وہ جو کچھ کرتے تھے، خدا کی مدد سے کرتے تھے۔ اس کے برعکس سحر نام ہے غیر اللہ میں تصرف کی طاقت فرض کرکے اس کی بنیاد پر باطل کرشمے دکھانے کا۔ مثلاً ستاروں میں تاثیر کا عقیدہ، جنات کو مسخر کرنے کا عقیدہ، وغیرہ۔ مشرک قوموں اور توہم پرست طبقوں میں اس کا رواج کثرت سے پایا جاتا ہے۔ مگر جب اسلام آیا تو اس نے ان چیزوں کو حرام قرار دیدیا۔ یہاں سحر (جادو) سے متعلق کچھ حدیثیں نقل کی جاتی ہیں:

انی خلقتُ عبادی حنفاء فاجتالتهم الشیاطین عن دینهم۔
(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ ۴۳۲)

حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے اپنے بندوں کو سیدھا اور صحیح پیدا کیا ہے۔ پھر شیطانوں نے ان کو ان کے دین سے پھیر دیا۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من اتى عرافا او كاهنا فقد كفر بما أُنزل على محمد

جو شخص نجومی یا کاہن کے پاس جائے تو اس نے اس چیز کا انکار کیا جو محمد پر اتاری گئی ہے۔

من عقد عقدة ونفث فيها فقد سحر

جس شخص نے گرہ لگائی اور اس میں پھونک ماری تو اس نے جادو کیا (اور جادو اسلام میں نہیں)

حد الساحر ضربه بالسيف

ساحر کی حد اس کو تلوار سے مارنا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۱۴۴)

قرآن وحدیث کی ان تصریحات کی بنا پر فقہاء اسلام نے لکھا ہے کہ جس شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ شیاطین اس کے لیے جو چاہے کر سکتے ہیں تو وہ کافر ہے (من اعتقد ان الشياطين تفعل له مايشاء فهو كافر، تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول صفحہ ۱۴۷)

تشویہ حقائق

دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) سے ایک عربی اخبار نکلتا ہے جس کا نام الرائد ہے۔ اس کے شمارہ ۲۱ صفر ۱۴۰۸ھ (۱۶ اکتوبر ۱۹۸۷) میں صفحہ اول پر ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اسلام کے معاندین اسلام کو پیش کرنے میں جو طریقہ اختیار کرتے ہیں، اس کو اس مضمون میں بجا طور پر تشویہ الحقائق سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی حقیقتوں کو مسخ کرکے پیش کرنا۔

معاندین اسلام کا یہی عام طریقہ ہے جو دور اول کے یہود سے لے کر موجودہ زمانہ کے مستشرقین تک میں پایا جاتا ہے۔ یہ طریقہ وہ اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر انھوں نے حقیقت کو اس کی اصلی اور واقعی صورت میں پیش کیا تو وہ لوگوں کو اسلام سے بدظن کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اس لیے وہ اسلام کی تعلیم یا اسلام کی تاریخ کو بگاڑ کر خود ساختہ صورت میں پیش کرتے ہیں تاکہ آسانی کے ساتھ اس کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا جا سکے۔

مثال کے طور پر ہجرت اسلامی تاریخ کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ اس واقعہ کو اگر سادہ طور پر "ہجرت" کہا جائے تو اس سے یہ تصور سامنے آتا ہے کہ یہ مقام عمل کی تبدیلی تھی جو سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت کی گئی۔ مگر معاندین اسلام بالقصد اس کے لیے ایسا لفظ استعمال کرتے ہیں جو فرار کے ہم معنی ہو۔ اس طرح ہجرت کا مفہوم بالکل بدل جاتا ہے۔ اب اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ نعوذ باللہ یہ ایک بزدلانہ فعل تھا جو انفعالی نفسیات کے تحت اختیار کیا گیا۔

الرسالہ کے مشن کے خلاف آج کل بہت کچھ لکھا اور بولا جا رہا ہے۔ مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ تمام لوگ بلا استثنا اسی طریقہ (تشویہ حقائق) کو استعمال کر رہے ہیں جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ یعنی الرسالہ کی بات کو بگاڑ کر پیش کرنا اور اس خود ساختہ بات کو الرسالہ کی بات قرار دے کر اس کی تنقید و تنقیص کرنا۔ مزید حیرت یہ ہے کہ خود ندوہ کے مذکورہ عربی اخبار (الرائد) نے بھی اسی آزمودہ طریقہ کو نہایت بے تکلفی کے ساتھ ہمارے خلاف استعمال کیا ہے، اور اس کا یہ استعمال عین اسی شمارہ میں ہے جس میں اس نے یہودیوں اور عیسائیوں کو تشویہ حقائق کا مجرم قرار دے کر شدت کے ساتھ ان کو نشانہ ملامت بنایا تھا۔

الرائد کے مذکورہ شمارہ میں آخری صفحہ پر "اخبار و تعلیقات" کے تحت ایک مضمون درج ہے۔ اس میں راقم الحروف (وحید الدین خاں) کے ایک مطبوعہ مقالہ (ٹائمس آف انڈیا ۱۵ ستمبر ۱۹۸۷) کا حوالہ دیتے ہوئے میرے بارہ میں خبر دی گئی ہے کہ ——— "انھوں نے اس میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ اکثریتی فرقہ کی نسبت سے شکایت اور ناگواری کا طریقہ چھوڑ دیں اور اپنے مطالبات سے دستبردار ہو جائیں اور حالات کی تبدیلی کا اعتراف کر لیں اور شکست کو قبول کر لیں اور حقیقتِ حال کا سامنا کریں اور اپنے سیاسی موقف سے ہٹ جائیں اور پچھلی سیٹوں پر بیٹھ جائیں اور نئے حالات کی روشنی میں نئے دور کا آغاز کریں"۔ الرائد کے اصل الفاظ یہ ہیں :

نصح فیه المسلمین بان یترکوا طریق الشکوی، والکراهیة بالنسبة للاغلبیة ویتنازلوا عن مطالبهم ویعترفوا بتغیر الوضع، ویقبلوا الهزیمة، ویواجهوا حقائق الوضع، وینسحبوا من موقفهم السیاسی، ویقعدوا فی المقاعد الخلفیة ویبدؤا عهداً جدیداً فی ضوء الظروف الجدیدة۔

الرائد کی مذکورہ عبارت تشویہ حقائق کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ اس کو پڑھ کر ایک آدمی سمجھے گا کہ راقم الحروف نے مسلمانوں سے یہ کہا ہے کہ وہ نئے حالات کے آگے ہتھیار ڈال دیں اور اکثریتی فرقہ کے مقابلہ میں ہزیمت اور پسپائی کی حیثیت کو قبول کرنے پر راضی ہو جائیں۔ حالاں کہ ٹائمس آف انڈیا (۱۵ ستمبر ۱۹۸۷) کے مفصل مقالہ کو پڑھ کر کوئی بھی شخص سمجھ سکتا ہے کہ میں نے جو بات کہی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ میں نے تدبیری حکمت کی بات کہی ہے نہ کہ کسی قسم کی انہزامی پوزیشن اختیار کرنے کی۔

الرائد کی مطبوعہ "خبر" سے بظاہر یہ متبادر ہوتا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے لیے دو راستے ہیں۔ ایک کفاح اور مطالبۂ حقوق کا راستہ۔ دوسرا، استلام اور انہزام کا راستہ۔ اس کے مطابق میرا کہنا یہ ہے کہ مسلمان کفاح اور مطالبہ کا راستہ چھوڑ کر استلام اور انہزام کا راستہ اختیار کر لیں۔ یہی ان کے لیے موجودہ حالات کا تقاضا ہے۔ الرائد کی یہ بات یقینی طور پر تشویہ حقائق ہے نہ کہ اصل واقعہ کی ترجمانی۔

ٹائمس آف انڈیا کے زیر بحث مضمون میں جو بات کہی گئی، وہ اس کے برعکس یہ تھی کہ مسلمان

اس ملک میں دو چیزوں کے درمیان ہیں۔ ایک پیش آمدہ مسائل، اور دوسرے امکانی مواقع۔ تاریخ کا تجربہ ہے کہ جو لوگ حال کے مسائل میں الجھتے ہیں۔ وہ مواقع کو استعمال کر کے اپنے مستقبل کی تعمیر نہیں کر پاتے۔ اس ملک کے مسلمان پچھلے چالیس سال سے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں، اس لیے وہ مستقبل کی طرف ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے۔

اب مسلمانوں کے لیے بہترین راہ یہ ہے کہ وہ مسائل کے بارہ میں "صبر" کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے مواقع کو بھرپور طور پر استعمال کریں تاکہ ان کا کل ان کے آج سے بہتر ہو سکے۔ اس مشورہ کو انگریزی میں ان الفاظ میں درج کیا گیا تھا:

Starve the problems, feed the opportunities.

ہندستان کے مسلمان اپنے لیڈروں کی رہنمائی میں احتجاجی طریقہ پر عمل کرتے رہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں میں تعمیری طریقہ اختیار کرنے کا داعی ہوں۔ یہی بات مذکورہ مضمون میں بھی کہی گئی ہے۔ مطبوعہ ریکارڈ کے مطابق، یہ بات میں نے پہلی بار انجمن تعلیمات دین کے ایک جلسہ میں پیش کی تھی جو ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۰ کو گونڈہ میں ہوا تھا اور جس میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اور قاضی عدیل عباسی وغیرہ شریک تھے۔ ۶۶-۱۹۶۵ کے دوران میں نے یہی بات ندائے ملت (لکھنؤ) کے صفحات میں پیش کی۔ ۱۹۶۷ سے ۱۹۷۴ تک میں اس کو الجمعیۃ ویکلی (دہلی) میں پیش کرتا رہا اب ۱۹۷۶ سے یہی بات ماہنامہ الرسالہ کے صفحات میں پیش کر رہا ہوں۔

ٹائمس آف انڈیا کے مذکورہ مقالہ میں بھی میں نے یہی بات کہی ہے۔ یہ موجودہ حالات کے اعتبار سے عین اسلامی بات ہے۔ اور یہ وہی بات ہے جس کا ایک اعلیٰ نمونہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں صلح حدیبیہ کی صورت میں ملتا ہے۔ مقالہ کا حسب ذیل پیراگراف میرے نقطۂ نظر کا خلاصہ ہے:

In this world (of competition) it is only those who stop railing against defeat and accept it with a view to doing something positive about the situation who can ultimately succeed. We should never lose sight of the fact that a strategic retreat makes it possible to return to the fray. Such tactics were very well understood by the Muslims 1,400 years ago when they drew up the peace treaty of Hudaibiya which, although apparently over-conciliatory towards the opponent, ultimately permitted the Islamic mission to go forward unhindered.

یعنی یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں جو لوگ شکست کے خلاف شکوہ شکایت چھوڑ دیں اور حالات کے بارہ میں کچھ مثبت کام کرنے کی خاطر اس کو مان لیں، وہی آخر کار کامیاب ہوتے ہیں۔ ہمیں کبھی اس حقیقت کو بھولنا نہیں چاہیے کہ تدبیری طور پر پیچھے ہٹنا، دوبارہ میدان مقابلہ میں آنے کو ممکن بناتا ہے۔ اس حکمت عملی کو چودہ سو سال پہلے مسلمانوں نے بہت اچھی طرح سمجھ لیا تھا جب کہ انھوں نے حدیبیہ کے صلح نامہ کو تیار کیا تھا۔ یہ صلح اگرچہ بظاہر دشمن سے بہت زیادہ جھک کر کی گئی تھی۔ مگر آخر کار اس نے اسلامی مشن کو یہ موقع دیا کہ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھتا چلا جائے۔

ٹائمس آف انڈیا کے مذکورہ مضمون میں ایک ذیلی سُرخی ان الفاظ میں قائم کی گئی تھی:

Strategic Retreat.

یعنی تدبیری واپسی۔ یہ عین وہی بات ہے جو خود قرآن (الانفال ۱۶) میں کہی گئی ہے۔ مگر الرّائد نے تشویہ حقائق کے اصول کے تحت یہ کیا کہ اس نے صرف لفظ Retreat کو لے لیا اور دوسرے لفظ Strategic کو حذف کر دیا۔ یعنی جو چیز "تدبیری واپسی" کے طور پر کہی گئی تھی اس کو صرف "واپسی" بنا کر پیش کر دیا۔

یہ وہی طریقہ ہے جس کے ذریعہ کسی نے قرآن سے یہ حکم نکال لیا تھا کہ "نماز کے قریب نہ جاؤ" اور اس عجیب و غریب قرآنی تعلیم کا ماخذ یہ تھا کہ اس نے قرآن کی ایک آیت کو ادھوری شکل میں پیش کیا۔ قرآن میں کہا گیا تھا کہ: لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى۔ (النساء ۴۳) اس نے سادہ طور پر یہ کیا کہ آیت کے آخری لفظ کو حذف کر دیا اور کہا کہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ لا تقربوا الصلوٰۃ اگر یہ کوئی طریق استدلال ہے تو اس طرح ہر بات ثابت کی جا سکتی ہے، خواہ وہ کتنی ہی زیادہ اُلٹی بات کیوں نہ ہو۔

ایک سفر

جموں میں ۱۲ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ (۵ نومبر ۱۹۸۷) کو میلاد النبی کا سالانہ جلسہ تھا۔ اس موقع پر شرکت کے لیے جموں کا سفر ہوا۔ ۴ نومبر کو دہلی سے جموں جانے والا جہاز (۴۲۱) روانگی کے لیے تیار تھا کہ اچانک جہاز کے اندر ایک غیر معمولی سرگرمی شروع ہوگئی۔ جہاز کا عملہ انگریزی زبان اور ہندستانی زبان میں بار بار یہ اعلان کر رہا تھا کہ دہلی سے گوہاٹی جانے والے کوئی مسافر غلطی سے اس جہاز میں آگیے ہیں، وہ فوراً اتر جائیں۔ کیوں کہ یہ جہاز دہلی سے جموں جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر کی تلاش و تحقیق کے بعد آخر کار مذکورہ مسافر کا پتہ چل گیا اور ان کو فوری طور پر جہاز سے اتار کر دوسرے جہاز پر سوار ہونے کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ دوسری طرف میں نے دیکھا کہ جہاز کے عملہ کا ایک شخص "واکی ٹاکی" لیے ہوئے بار بار دوسرے جہاز کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ براہ کرم جہاز کو روکیے، مسافر آرہا ہے :

Hold the flight please. Passenger is coming.

گیٹ کے نگراں نے بورڈنگ کارڈ کو چک کر کے پتہ کیا کہ اس جہاز میں ایک غلط مسافر داخل ہوگیا ہے۔ لاوڈ اسپیکر نے مسافر کو اس کی غلطی سے مطلع کیا۔ اسی کے ساتھ وائرلیس نے دو جہازوں کو مسلسل مربوط رکھ کر اس کو ممکن بنایا کہ مذکورہ مسافر فلائٹ نمبر ۴۲۱ سے اترے اور فلائٹ نمبر ۴۸۷ میں جا کر سوار ہو سکے۔ اور یہ سب کچھ صرف چند منٹ کے اندر انجام پا گیا ——— یہ اجتماعی کوشش یا ہم آہنگ عمل کا نتیجہ تھا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اجتماعی عمل میں برکت ہے۔

دہلی سے چندی گڑھ تک کی پرواز میں ہمارے نیچے زمین ہموار دکھائی دے رہی تھی۔ جموں کی قریبی فضا میں پہنچے تو زمین اونچی نیچی نظر آنے لگی۔ یہ پہاڑی اُبھار تھے جو دور سے اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے کہ بے شمار اونٹ اپنی کوہانیں بلند کیے ہوئے کھڑے ہوں۔ زمین میں کچھ ہموار علاقے ہیں اور کچھ پہاڑی علاقے۔ دونوں میں کچھ کمیاں ہیں اور دونوں میں کچھ خوبیاں ہیں۔ زمین اگر سب کی سب ایک انداز کی ہوتی تو اس میں کچھ خصوصیات ہوتیں اور کچھ خصوصیات نہ ہوتیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے تنوع کا اصول جاری کر کے ہماری زمین کو ہر قسم کے خیر کا خزانہ بنا دیا ہے۔ اگر زمین میں یکسانیت کا اصول جاری ہوتا تو وہ انسان کے لیے ہر قسم کے خیر کا مجموعہ نہیں بن سکتی تھی۔

اس سے پہلے ۱۹۸۲ میں میں نے جموں کے اس سرسبز و شاداب علاقہ کا ایک مختصر سفر کیا تھا۔ اس وقت کا ایک تاثر میری ڈائری میں حسب ذیل الفاظ میں درج ہے۔

انسان زمین کے اوپر ایک تضاد ہے۔ وہ حقیقتوں کی دنیا میں حقیقتوں کو نظر انداز کر کے رہنا چاہتا ہے۔ انسان کو ایک نہایت حسین اور مکمل دنیا دی گئی ہے۔ مگر وہ اس طرح یہاں رہتا ہے جیسے وہ اپنی دنیا کی تردید کر رہا ہو۔

انسان کھلے ہوئے آسمان کے نیچے بند ذہن کے ساتھ جینا چاہتا ہے۔ لطیف ہواؤں کے درمیان اس کو صرف کثیف اخلاق کے ساتھ رہنا پسند ہے۔ اونچے پہاڑوں کے پڑوس میں وہ چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ سرسبز و شاداب درختوں کے ماحول میں وہ ٹھنٹھ بنا ہوا نظر آتا ہے۔ دریاؤں اور چشموں کی روانی کے درمیان وہ جمود و تعطل کی تصویر بنا ہوا ہے۔

اس صورت حال کی سب سے زیادہ عبرت ناک مثال وہ لوگ ہیں جن کو مسلمان کہا جاتا ہے۔ ۱۳ جولائی ۱۹۸۲ کو میں جموں اسٹیشن پر ٹرین کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ دو مسلمان میرے پاس آئے جو غالباً کشمیری تھے۔ ایک نے کہا "مولانا صاحب، مجھے ایک مسئلہ بتایئے۔ لبنان میں فلسطینی بھائیوں کا خون ہو رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے خون کے صدقہ کے طور پر ایک بکرا ذبح کروں"۔ دوسرے نے کہا "میں فلسطین جانا چاہتا ہوں، مجھے بتایئے کہ فلسطین جانے کا راستہ کیا ہے"۔ دونوں مجھ سے مشورہ چاہتے تھے، مگر میں ان کو کوئی مشورہ نہ دے سکا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دماغ میں الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے اور اب میرے پاس ان سے کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی شاید سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خیالی پرواز میں سب سے آگے ہیں اور حقیقی عمل میں سب سے پیچھے۔ ان کو سیاست میں صرف نعرہ پسند ہے، ادب میں شاعری اور دین میں رومانیت۔ مسلمانوں نے نہ اپنی مقدس کتاب سے کچھ سیکھا اور نہ دنیا کے تجربات سے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصاغر و اکابر کی تمام فوج خوش فکری کے خول میں بند ہے۔ اپنے فکری خول سے باہر کی حقیقتوں کی اسے خبر ہی نہیں۔

آخر ایسے لوگوں کو کیا مشورہ دیا جائے جو فلسطین جیسے سنگین مسئلہ میں اپنا حصہ ادا کرنے کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کے لئے ایک بکرا ذبح کر دیں۔ یا اپنی انتہائی بے خبری اور بے مائگی کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ کسی طرح فلسطین پہنچ جائیں تو وہاں لڑ کر وہ اس کا سارا مسئلہ حل کر دیں گے۔

جموں ریاست جموں وکشمیر کی سرمائی راجدھانی ہے۔ یہاں ڈوگرہ راجپوت کی حکومت تھی۔ ۱۹ ویں صدی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس پر قبضہ کر لیا۔ رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد دوبارہ گلاب سنگھ کا قبضہ ہوگیا۔ اب یہ ریاست دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔

جموں کی ابتدائی تاریخ کے بارہ میں یہ روایت ہے کہ راجہ جمبو نے ایک مرتبہ اس علاقہ میں شکار کے دوران دیکھا کہ ایک شیر اور بکری ایک ہی تلاب میں اکٹھے پانی پی رہے ہیں۔ راجہ اس سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے اس مقام کو مقدس سمجھتے ہوئے یہاں ایک نئے شہر کا سنگ بنیاد رکھ دیا اور اس کو جمبو نگری کا نام دیا۔ بعد کو یہ مقام جموں کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اور راجہ جمبو لوچن کی راجدھانی قرار پایا۔

۱۹۴۷ تک واقعۃً یہ علاقہ ایسا ہی تھا۔ یہاں مختلف فرقے اور مختلف طبقے کے لوگ محبت کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے۔ مگر ۱۹۴۷ کے "انقلاب" نے صورت حال بدل دی اور وہ بدستور اب تک بدلی ہوئی ہے۔

میرے پاس انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا ۱۹۸۴ کا اڈیشن ہے۔ اس میں جموں وکشمیر کا ذکر دو مقام پر ہے۔ ایک، مائیکرو پیڈیا جلد پنجم (صفحہ ۵۱۲) میں، اور دوسرے میکرو پیڈیا جلد ۱۰ (صفحہ ۲۹) میں۔

اس سفر کے دوران میں نے چاہا کہ جموں کے بارہ میں ضروری معلومات حاصل کروں۔ اس کو کھولا تو دونوں مقامات پر ایک مشترک منظر تھا۔ دونوں مقامات پر ابتدائی پیراگراف تقریباً ایک ایک انچ کے بقدر مٹایا ہوا تھا۔ (ملاحظہ ہو نقشہ اگلے صفحہ پر) مطبوعہ سطروں پر اتنی گہری سیاہی پھیری ہوئی تھی کہ کسی طرح بھی ان سطروں کا پڑھنا ممکن نہ تھا۔ غور کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ ہند سرکار کے حکم سے مٹایا گیا ہے۔ غالباً اس میں کچھ ایسے الفاظ تھے جو ہند سرکار کے نزدیک قابل اعتراض تھے۔ اس قیاس کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ انسائیکلو پیڈیا کی جلدوں میں ابتدائی صفحہ پر اسٹیمپ کے ذریعہ بعد کو یہ الفاظ ثبت کیے گیے ہیں:

The external boundaries of India as depicted in the maps are neither correct not authentic.

(انڈیا کی بیرونی سرحدیں جو نقشوں میں دکھائی گئی ہیں وہ نہ صحیح ہیں اور نہ مستند)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ہندستان کی تمام قابلِ ذکر لائبریریوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ ادارہ اپنی اس کتاب کے ذریعہ ہندستان سے ہر سال کروروں روپیہ حاصل کرتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ کتاب (اسی نوعیت کی دوسری کتابوں کی طرح) مغربی علم کی برتری کی ایک خاموش تبلیغ ہے۔ وہ ہندستان کے اوپر ایک قسم کا فکری حملہ (Intellectual invasion) ہے۔ یہ فکری حملہ اتنا قوی ہے کہ وہ خود "جموں اینڈ کشمیر" کے اس آرٹیکل میں بھی بالواسطہ طور پر موجود ہے جس کی چند سطروں پر سیاہی پھیر کر ہند سرکار اپنے کو فتح مند سمجھ رہی ہے۔ اس سلسلہ میں آرٹیکل کی حسب ذیل سطریں ملاحظہ ہوں:

In the early 1970s, after a quarter of a century, the "Kashmir problem" remained intractable. Although there was a clear Muslim majority in the state before the 1949 partition and its economic, cultural, and geographic continuity with the Muslim-majority area of the Punjab could be convincingly demonstrated, the accidents of history have resulted in a division of territory that has no rational basis (Vol. 10, p. 32).

ہندسرکار نے ۳۰ جلدوں کی اس کتاب کی جن چند سطروں پر اعتراض کیا تھا، اگر اس کے ناشرین اس اعتراض کو نہ مانتے اور ان سطروں کو مٹانے پر راضی نہ ہوتے تو یقینی تھا کہ اس کتاب کی درآمد ہندستان میں بند کر دی جائے۔ مگر انھوں نے اس اعتراض کو بلا بحث قبول کرتے ہوئے اس کو مٹا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لیے اپنی کتاب کی درآمد کا وسیع دروازہ کھل گیا۔

بعض اوقات اپنی لکھی ہوئی سطروں کو خود اپنے ہاتھ سے مٹانا پڑتا ہے تاکہ وہ دوبارہ زیادہ وسیع دائرہ میں لکھی جائیں۔ یہ زندگی کا اہم ترین راز ہے۔ اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو اس راز کو جانیں، اور اس سے بھی کم وہ لوگ ہیں جو اس پر عمل کرنے کا حوصلہ کر سکیں۔

جموں وکشمیر ہندستان کی واحد ریاست ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ وادی کے علاقہ میں مسلمان ۹۰ فی صد ہیں۔ جموں کے علاقہ میں مجموعی طور پر ۳۰ فی صد ہیں۔ اور پوری ریاست جموں وکشمیر میں تقریباً ۶۵ فی صد۔ مزید یہ کہ اس ریاست کو دستور ہند کی دفعہ ۳۷۰ کے تحت مخصوص تحفظاتی درجہ ملا ہوا ہے۔

اس اعتبار سے جموں وکشمیر کے مسلمانوں کے لیے یہاں ترقی کا خصوصی راستہ کھلا ہوا تھا۔ مگر میرا اندازہ ہے کہ جموں وکشمیر کے مسلمان اپنی اس خصوصی حیثیت کا وہ فائدہ حاصل نہ کر سکے جو وہ حالات کے اعتبار سے حاصل کر سکتے تھے۔ اس کا واحد سبب وہی ہے جس کو مذہب کی اصطلاح میں عدمِ قناعت کہا جاتا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کے لیے عملاً جو چیز قابلِ حصول تھی، اس پر وہ قانع نہیں ہوئے۔ اور جو چیز عملاً قابلِ حصول نہ تھی، اس کے پیچھے دوڑتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے "ناممکن" کے تعاقب میں "ممکن" کو بھی کھو دیا۔

ماضی کو بھلا کر حال پر قانع ہونا، مستقبل کی تعمیر کا واحد راز ہے۔ لوگ ماضی کو بھلا نہیں پاتے، اسی لیے وہ حال کے امکانات کو بھی استعمال نہیں کر پاتے۔ یہ تبصرہ موجودہ زمانہ کے تمام مسلمانوں پر صادق آتا ہے، خواہ وہ اقلیتی علاقہ کے مسلمان ہوں یا اکثریتی علاقہ کے مسلمان۔

کچھ لوگوں نے بتایا کہ پونچھ میں دیوبندی اور بریلوی کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ حتی کہ پولیس کو مداخلت کرنی پڑی۔ گفتگو کے دوران میں نے پوچھا کہ بریلوی حضرات کس قسم کی باتیں کرتے ہیں جس کے ذریعہ وہ مسلم عوام کو دیوبندیوں کے خلاف بھڑکانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ انھوں

نے بتایا کہ مثلاً ایک بریلوی مقرر کھڑا ہو کر کہے گا: دیکھو قرآنی آیت (لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر) کا ترجمہ دیوبندی عالم نے اس طرح کیا ہے: "تاکہ اللہ تمہارے سب اگلے اور پچھلے گناہوں کو معاف کر دے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے محبوب پیغمبر بھی گنہ گار تھے۔ اور جو شخص خدا کے محبوب پیغمبر کو گنہ گار بتائے وہ کیسے مسلمان ہو سکتا ہے ——— اس قسم کی باتوں سے امت میں تفریق پیدا ہوتی ہے، مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا یہ تضاد عجیب ہے کہ ایک طرف ہر ایک اتحاد کی بات کر رہا ہے۔ دوسری طرف ہر ایک مذکورہ نوعیت کی ایک یا دوسری بات لے کر امت کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں بانٹ رہا ہے۔

حافظ عبدالرحمٰن (پیدائش ۱۹۶۰) نے اپنی زبان میں کہا "یہ جو ۱۹۴۷ ہوئی، وہ اسلام کے اندر رکاوٹ بن گئی"۔ انھوں نے بتایا کہ پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی نفرت نہیں تھی۔ اس وقت مذہبی تعصب نہیں تھا۔ کوئی مسلمان فقیر (بزرگ) آگیا تو ہندو مسلمان سب اس کی عزت کرتے تھے۔ حتی کہ بہت سے غیر مسلم اس کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیتے تھے اور کوئی برا نہیں مانتا تھا۔ اس وقت لوگ سادہ تھے۔ کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔ اب محاذ آرائی ہونے لگی۔ اس کی وجہ سے ماضی کے تمام امکانات برباد ہو گیے۔ اگر پہلے والے حالات جاری رہتے تو اب تک کیا سے کیا ہو گیا ہوتا۔

انھوں نے ایک شخص (مسٹر گنیش ایم اے) کا قصہ بتایا۔ ان کو اسلام سے سخت نفرت تھی۔ اسی نفرت کی وجہ سے انھوں نے اسلام پر کتابیں پڑھیں۔ وہ ابتداءً نفرت کا شکار تھے۔ وہ "رنگیلا رسول" کی باتیں دہراتے تھے۔ مگر مطالعہ کے بعد ان پر اسلام کی سچائی آشکارا ہو گئی۔ حافظ عبدالرحمٰن صاحب سے اپنی روداد بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا "مگر اب میں کیڑا مسلمان ہوں"۔ ان کا نیا نام عبدالاحد ہے۔ اب وہ راجستھان میں رہتے ہیں۔

موجودہ مسلمانوں کا مزاج یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اسلام کے خلاف کچھ کہدے تو فوراً اس کو اسلام کا مستقل دشمن سمجھ لیتے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ ہمیشہ بہت ہی کم ہوتے ہیں جو کسی چیز کے ابدی دشمن ہوں۔ بیشتر لوگ ناسمجھی میں کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ اگر ان کی ناسمجھی کو دور کر دیا جائے تو عین ممکن ہے کہ جو شخص آج بظاہر دشمن نظر آتا ہے، وہ کل کے دن دوست

اور حامی بن جائے۔

جموں میں ہر سال ربیع الاول کے موقع پر میلاد النبی کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ یہ جلوس روایتی شان کے ساتھ جموں شہر کے مختلف علاقوں میں گھومتا ہوا جامع مسجد پہنچتا ہے۔ یہاں "اسلامی جھنڈے" کو سلامی دی جاتی ہے۔ جھنڈے کی شان میں ایک نظم پڑھی جاتی ہے۔ اس تقریب کے بعد ظہر کی نماز ہوتی ہے اور ظہر کی نماز کے فوراً بعد جلسہ شروع ہو جاتا ہے۔

میں نے دیکھا تو جلوس میں کافی مسلمان شریک تھے۔ ابتداءً میں نے سمجھا کہ یہ سب جموں شہر کے مسلمان ہیں۔ مگر پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس میں جموں شہر کے لوگ پانچ فیصد یا دس فی صد ہوں گے۔ ورنہ زیادہ تر لوگ اطراف کے دیہاتوں سے آئے ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ اس قسم کے جلوسوں میں عام طور پر "شرفاء اور معززین" شریک نہیں ہوتے۔ عوام اور جاہل قسم کے مسلمان ہی زیادہ شریک ہوتے ہیں۔ اور یہی صورت حال ہر جگہ پائی جاتی ہے۔

جلوسوں کی اسی نوعیت کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جلوس کے بعد فساد شروع ہو جاتا ہے۔ میں ذاتی طور پر جلوس کی سیاست کا قائل نہیں، مگر جو لوگ جلوس کے طریقہ میں یقین رکھتے ہیں، انھیں سب سے پہلے شرفاء مسلمین کو شرکت جلوس کے لیے آمادہ کرنا چاہیے۔ اس سے پہلے جلوس نکالنا اس مقصد کے لیے مفید نہیں ہو سکتا جس کے لیے جلوس نکالا جاتا ہے۔

جلسہ کی دو نشستیں ہوئیں۔ ایک ظہر اور عصر کے درمیان۔ اور دوسری نشست نماز مغرب کے بعد۔ کئی مقررین کی تقریریں ہوئیں۔ میں نے دن کی نشست میں مختصر طور پر سیرت کے اخلاقی پہلو پر گفتگو کی۔ شام کی نشست میں مفصل خطاب کیا۔ اس خطاب کا موضوع سیرت کا عالمی اور آفاقی پہلو تھا۔ شام کے جلسہ کی کارروائی ٹیلی وژن پر بھی دکھائی گئی۔ ۶ نومبر کو جمعہ کا دن تھا۔ لوگوں کی فرمائش پر یہاں کی جامع مسجد میں "نماز" کے موضوع پر ایک خطاب ہوا۔ وسیع مسجد پوری کی پوری بھری ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ ان نمازیوں میں بیشتر تعداد تعلیم یافتہ حضرات کی تھی۔

جموں شہر پوری ریاست جموں وکشمیر کا تجارتی مرکز ہے۔ مگر یہاں کی تجارتوں میں مسلمانوں کا کوئی قابل ذکر حصہ نہیں۔ یہاں مسلمانوں کی چند معمولی دکانیں ہیں۔ تمام بڑی بڑی تجارتیں

۹۹ فی صد سے بھی زیادہ ہندو صاحبان کے قبضہ میں ہیں۔ حتی کہ سیرت النبی کے جلسہ کے لیے جو ٹنٹ لگایا گیا تھا، میں نے دیکھا تو اس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا: "راما ٹنٹ اینڈ لائٹ ہاؤس"۔

شہر میں گھومتے ہوئے میں نے دو کافی بڑی بڑی بلڈنگیں دیکھیں۔ یہ دونوں بلڈنگیں مسلم اوقاف کے محکمہ کی ہیں۔ یہ دونوں اہم مقامات پر ہیں اور ان میں بہت سی دکانیں بنی ہوئی ہیں۔ مگر اس خالص "مسلم جائداد" میں بھی زیادہ تر دکانیں غیر مسلم صاحبان کی تھیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اوقاف والوں نے دکان کو الاٹ کرنے کے لیے "ایڈوانس" رقم کی شرط لگا رکھی تھی۔ مسلمان اپنی اقتصادی کمزوری کی وجہ سے ایڈوانس رقم کی شرط پوری نہ کر سکے۔ اس لیے زیادہ تر دکانیں غیر مسلم صاحبان کے قبضہ میں چلی گئیں۔

میں نے سوچا کہ مسلم اوقاف کی بلڈنگ پر ہندو صاحبان کا قبضہ کسی تعصب کی بنا پر نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر وہ کیا چیز ہے جس نے غیر مسلم صاحبان کو یہ موقع دیا کہ وہ ایک مسلم جائداد پر قابض ہو جائیں۔ اس کا جواب ایک لفظ میں "انٹرسٹ" ہے۔ یہ دنیا انٹرسٹ کا کھیل ہے۔ ہر آدمی اپنے مفاد کے تحت عمل کرتا ہے۔ محکمہ اوقاف کو مالی فائدہ اس میں نظر آیا کہ وہ اپنی دکانیں غیر مسلم صاحبان کو دے۔ اس لیے اس نے اپنی دکانیں غیر مسلم صاحبان کو دے دیں۔ اس کے برعکس اگر وہ دیکھتے کہ مسلمانوں کو دینے میں فائدہ ہے تو وہ اپنی دکانیں مسلمانوں کے حوالے کرتے۔ مسلمان اگر اس ناگزیر شرط کو پورا نہ کر سکیں تو وہ یقینی طور پر ناکام رہیں گے۔ خواہ وہ مسلم اقلیت کے ملک میں ہوں یا مسلم اکثریت کے ملک میں۔ رعایت کی بنیاد پر کبھی کوئی قوم اس دنیا میں کھڑی نہیں ہو سکتی۔

ایک صاحب ایک کتاب لائے جس کا نام "انوار الانتباہ" تھا۔ اس میں عجیب و غریب قسم کی طلسماتی باتیں درج تھیں۔ اس کتاب کا خلاصہ یہ تھا کہ بزرگوں سے مدد مانگنا جائز ہے۔ "امام شیخ الاسلام شہاب رملی سے استفتاء ہوا کہ عام لوگ جو سختیوں کے وقت انبیاء و مرسلین اور اولیاء و صالحین سے فریاد کرتے اور یا رسول اللہ، یا علی، یا شیخ عبدالقادر جیلانی اور ان کے مثل کلمات کہتے ہیں۔ یہ جائز ہے یا نہیں، اور اولیاء بعد انتقال کے مدد فرماتے ہیں یا نہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ بیشک انبیاء و مرسلین اور اولیاء و علماء سے مدد مانگنی جائز ہے اور وہ بعد انتقال بھی مدد فرماتے ہیں"۔

ایک "واقعہ" ان الفاظ میں درج تھا: ایک بار حضرت سیدی مدین بن احمد شمونی نے وضو

فرماتے ہیں ایک کھڑاؤں بلاد مشرق کی طرف پھینکی۔ سال بھر بعد ایک شخص حاضر ہوئے اور کھڑاؤں ان کے پاس تھی۔ انھوں نے حال عرض کیا کہ جنگل میں ایک بدوضع نے ان کی صاحبزادی پر دست درازی کرنا چاہا۔ لڑکی کو اس وقت اپنے باپ کے پیر و مرشد حضرت سیدی مدین کا نام یاد نہ تھا۔ یوں ندا کی: یاشیخ ابی لاحظنی (اے میرے باپ کے پیر مجھے بچائیے) یہ ندا کرتے ہی وہ کھڑاؤں آئی۔ لڑکی نے نجات پائی۔ وہ کھڑاؤں ان کی اولاد میں اب تک موجود ہے، صفحہ ۱۶۔

اسی قسم کے خرافاتی عقائد اور جھوٹے قصے کہانیاں ہیں جن میں موجودہ زمانہ کے مسلمان جی رہے ہیں۔ یہ مسلمان ایک خود ساختہ اسلام پر قائم ہیں نہ کہ اس اسلام پر جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے لائے تھے۔

۴ نومبر کو لاہور میں ریلائنس ورلڈ کپ ۱۹۸۷ کے لیے پاکستان اور آسٹریلیا کے درمیان کرکٹ کا سیمی فائنل تھا۔ میں جموں کے بازار میں نکلا تو ہر دکان پر لوگ ٹیلی ویژن کے اوپر بھیڑ لگائے ہوئے کھڑے تھے۔ کچھ لوگ اس حال میں راستہ چل رہے تھے کہ انھوں نے اپنے کان کے ساتھ ٹرانسسٹر لگا رکھا تھا۔ یہاں تک کہ سوا پانچ بجے چاروں طرف سے پٹاخے کی آوازیں آنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ پاکستان ہار گیا ہے اور آسٹریلیا ۱۸ رن سے جیت گیا۔ اس خوشی میں ہندو صاحبان پٹاخے چھوڑ رہے ہیں۔

اگلے دن ۵ نومبر کو دوسرا منظر تھا۔ آج بھی دوبارہ سیمی فائنل کا مقابلہ تھا۔ یہ مقابلہ ہندستان اور انگلینڈ کے درمیان ہو رہا تھا۔ سہ پہر کے وقت میں یہاں کے ایک مسلم محلہ میں تھا کہ اچانک پٹاخہ کی آوازیں آنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ آج ہندستان ہار گیا ہے اور انگلینڈ ۳۵ رن سے جیت گیا ہے۔ اب مسلمانوں کی خوشی کی باری تھی۔ آج کے دن مسلمان پٹاخے چھوڑ رہے تھے۔

میں نے ایک مسلمان سے کہا۔ یہ سراسر حماقت ہے۔ آخر مسلمان ایسی احمقانہ حرکت کیوں کرتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا۔ اس کے ذمہ دار ہندو صاحبان ہیں۔ وہ لوگ پاکستان کی ہار پر خوشی مناتے ہیں۔ اس کے رد عمل میں مسلمان بھی ہندستان کی ہار پر خوشی منا رہے ہیں۔ میں نے کہا اگر یہی وجہ ہے تو ایسا کرنے سے ہندو صاحبان کا یہ ذہن مزید بڑھے گا اور مسئلہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا چلا جائے گا۔ ہندو پٹاخہ بازی کا جواب مسلم پٹاخہ بازی نہیں ہے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ

ہندو پٹاخہ چھوڑیں تو مسلمان پٹاخہ نہ چھوڑیں۔ اس کے بعد ہندو پٹاخہ بازی اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔

ان مواقع پر مسلمان اگر اس چیز کا مظاہرہ کرتے جس کو "اسپورٹس مین اسپرٹ" کہا جاتا ہے تو وہ ملک میں ایک مفید روایت کو رواج دینے کا کریڈٹ پاتے۔ اس کے برعکس ردعمل کا مظاہرہ کرکے وہ صرف اس چیز کا اضافہ کر رہے ہیں جس کو ہندستان ٹائمس (۶ نومبر ۱۹۸۷) نے میچ فسادات (Match riots) کا نام دیا ہے۔

ایک صاحب سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کو حقیقت پسند بننا چاہیے۔ حقیقت پسندی ہی اس دنیا میں کامیابی کا راز ہے، خواہ آپ ہندستان میں ہوں یا کسی دوسرے ملک میں۔ میری یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اگلے دن معلوم ہوا کہ ریلائنس کپ کے میچ کے زمانہ میں وہ تمام دن گھر پر بیٹھے ہوئے کمنٹری سنتے رہتے ہیں۔ بجلی آرہی ہے تو ٹیلی ویژن پر اور اگر بجلی نہیں ہے تو ٹرانسسٹر پر۔ میں نے سوچا کہ جن لوگوں کا ذہن سطحی چیزوں میں اتنا زیادہ مشغول ہو وہ آخر کوئی گہری بات کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔

جموں میں محکمہ اوقاف نے ایک نہایت وسیع اور شاندار جامع مسجد تعمیر کی ہے۔ مولینا صدرالدین قاسمی اس مسجد کے امام ہیں۔ ان کے حالات کو قریب سے جاننے کا اتفاق ہوا۔ میرا احساس یہ ہے کہ ائمہ کی جماعت کے لیے وہ ایک نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مسجد کے امام کو عام طور پر بہت کم تنخواہ ملتی ہے۔ اس لیے ہر امام کے سامنے یہ مسئلہ رہتا ہے کہ وہ اپنی آمدنی کو کس طرح بڑھائے۔ عام طور پر ائمہ یہ کرتے ہیں کہ وہ یا تو تعویذ گنڈے کا کاروبار شروع کر دیتے ہیں۔ یا متولیوں اور بڑے لوگوں کی خوشامد اور حاضر باشی کے ذریعہ مزید فوائد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ ائمہ مسلمانوں کے اختلاف اور نزاع کو بڑھا کر اپنی اہمیت ثابت کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے کچھ فائدے حاصل کر سکیں۔ مولانا صدرالدین قاسمی نے اس قسم کی کوئی تدبیر نہیں کی۔ اس کے بجائے انھوں نے اپنے دو بھائیوں کی مدد سے تجارت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ۲۰ سالہ محنت کے نتیجہ میں آج یہاں ان کی دو کامیاب دکانیں وجود میں آچکی ہیں۔ ایک کپڑے کی اور دوسری کتابوں کی۔ ایک بھائی کپڑے کی دکان پر بیٹھتے ہیں اور دوسرے بھائی کتابوں کی دکان پر۔

تجارت کا یہ راستہ ہر امام کے لیے کھلا ہوا ہے۔ اپنے حالات کے لحاظ سے ہر امام اپنے مقام پر

کوئی تجارت شروع کر سکتا ہے اور محنت اور استقلال کے ذریعہ اس میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

عبدالمجید صاحب یہاں کی ایک مقبول شخصیت ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اب تو وہ بزنس میں لگ گیے ہیں۔ مگر اس سے پہلے وہ سیاست میں دلچسپی رکھتے تھے اور مقامی الکشن میں حصہ لے کر یہاں کے کونسلر بھی منتخب ہوئے۔ میں نے پوچھا کہ جموں شہر میں تو مسلمانوں کی تعداد بمشکل ۵ فی صد ہوگی، پھر آپ کس طرح یہاں کے الکشن میں کامیاب ہوئے تھے۔

انھوں نے مسکرا کر کہا کہ میری پالیسی وہی ہے جس کا آپ الرسالہ میں سبق دیتے ہیں۔ میں سب سے یکساں طور پر خوش اخلاقی کے ساتھ ملتا ہوں۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ سب کے ساتھ میرے اچھے تعلقات ہیں۔ چنانچہ الکشن میں جس طرح مسلمانوں نے مجھے ووٹ دیا، ہندوؤں نے بھی بڑی تعداد میں مجھ کو ووٹ دیا اور میں کامیاب ہوگیا۔ اگرچہ میرے مقابلہ میں ایک ہندو امیدوار بھی تھا ــــ جموں میں عبدالمجید صاحب کے لیے جو موقع تھا، وہی موقع مسلمانوں کے لیے پورے ملک میں ہے۔ بشرطیکہ وہ اس کو جانیں اور سلیقہ اور ہوش مندی کے ساتھ اس کو استعمال کر سکیں۔

عبدالمجید صاحب نے کہا کہ چلئے آپ کو شہر کی سیر کرا دیں۔ ان کے ساتھ روانہ ہو کر میں وہاں پہنچا جس کو "باغ بہو" کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک پرانا قلعہ تھا۔ اس کے آس پاس کی زمین کو ترقی دے کر اس کو پرفضا تفریحی مقام بنا دیا گیا ہے۔

یہاں قلعہ کے پاس ایک صاف ستھری مسجد نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ اس مسجد کو غالباً تین سو سال پہلے یہاں کے ہندو راجہ نے بنوایا تھا۔ یہ ایک علامت ہے کہ قدیم زمانہ میں یہاں کوئی ہندو مسلم مسئلہ نہ تھا۔ میں نے مسجد کو اندر جا کر دیکھا۔ اس کی از سر نو آرائش کی گئی ہے۔ میں نے تلاش کیا کہ کہیں اس کا ابتدائی سن تعمیر لکھا ہوا ہو تو اس کو نوٹ کروں۔ ایک بورڈ نظر آیا۔ قریب جا کر دیکھا تو اس پر "شاہی مسجد" کے ساتھ "۱۸۶۷" لکھنے کا اہتمام تو ضرور کیا گیا تھا، مگر وہاں مسجد کا سن تعمیر درج نہ تھا۔ مسلمانوں میں روایتی ذوق ضرورت سے زیادہ پایا جاتا ہے، مگر تاریخی ذوق ان کے اندر بقدر ضرورت بھی نہیں۔

باغ بہو کے قریب ایک جگہ بہت بڑے پیمانہ پر کھدائی اور تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ ریلوے لائن کی توسیع کی جا رہی ہے۔ ۱۹۴۷ میں دہلی سے صرف پٹھان کوٹ تک ریلوے لائن

تھی۔ اس کے بعد اس کو بڑھا کر جموں توی تک پہنچایا گیا۔ اب مزید ۶۵ میل کی توسیع کے ذریعہ اس کو اودھم پور تک لے جایا جا رہا ہے۔ یہ پورا راستہ اونچے پہاڑوں اور گہری کھائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ریلوے لائن کا بہت بڑا حصہ پلوں اور سرنگوں کے درمیان سے گزرے گا۔ ۱۹۴۷ کے بعد کشمیر کے علاقہ میں جس رفتار سے کام ہو رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے یہ قیاس کچھ زیادہ بعید نہیں کہ ایک دن یہ ریلوے لائن دہلی سے براہِ راست سری نگر تک پہنچا دی جائے گی۔ مسئلہ صرف اس کی "قیمت" کا ہے، اور ہندستان بہر حال اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔

راستہ میں ایک "چھتری" نظر آئی۔ ایک پہاڑی پر بیٹھنے کی جگہ بنا کر اس کے اوپر خاص طرح کی چھتری بنی ہوئی تھی۔ محکمۂ سیاحت کی طرف سے اس علاقہ میں اس قسم کے بہت سے تفریحی مقامات بنائے گیے ہیں۔ اوپر چڑھ کر ہم لوگ کچھ دیر تک وہاں بیٹھے۔ یہاں خالص ہوا تھی۔ چاروں طرف سرسبز پہاڑوں کا منظر پھیلا ہوا تھا۔ دور جموں شہر نیچا اونچا بسا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ قدرت کے اس ماحول میں آدمی خدا کی تجلیات میں گم ہو جاتا ہے۔ دل نے کہا کہ زندگی کے تقاضے اگر مجبور نہ کریں تو میں خدا کی اس حسین دنیا میں کھو جاؤں اور پھر کبھی اس سے باہر نہ آؤں۔

مگر موجودہ دنیا میں انسان سے یہ مطلوب نہیں۔ چڑیاں اگر اس سرسبز دنیا میں اڑیں تو وہ ان کے لیے زندگی کی سرگرمیوں کے ہم معنی ہے۔ لیکن انسان اگر ایسا کرے تو وہ اس کے لیے زندگی سے فرار کے ہم معنی بن جائے گا۔

جب ہم لوگ چھتری کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے، اس وقت میری نظر نیچے کی سڑک پر گئی۔ سڑک کے کنارے ایک پتھر لگا ہوا تھا جس پر یہ انگریزی الفاظ لکھے ہوئے تھے:

Drive with care.

(احتیاط کے ساتھ گاڑی چلاؤ) میں نے سوچا کہ سڑک بظاہر خاموش ہے۔ مگر وہ کتنی بڑی حقیقت کا اعلان کر رہی ہے۔ زندگی بھی ایک سڑک کی مانند ہے۔ یہاں ہم اکیلے نہیں چل رہے ہیں۔ بلکہ ہماری طرح دوسرے بہت سے لوگ اس پر اپنی گاڑیاں دوڑا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں محفوظ سفر کا واحد یقینی طریقہ یہی ہے کہ ہر آدمی چوکنا رہے، ہر آدمی احتیاط کے ساتھ اپنی گاڑی چلائے۔

سڑکوں سے گزرتے ہوئے راستہ میں کئی جدید طرز کی کالونیاں دکھائی دیں۔ کشادہ سڑکیں، کھلے مکانات، صاف ستھری زندگی۔ میں نے پوچھا کہ ان کالونیوں میں مسلمان کتنے ہوں گے۔ جواب ملا کہ ایک بھی نہیں۔ "مسلمان تالاب کھٹیکان سے نکلنا پسند نہیں کرتے"۔ یہی ذہنیت اکثر مقامات پر مسلمانوں کی ہے۔ مگر میں اس کو مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا ہوں۔ اس طرح مسلمان بیک وقت دو چیزوں سے محروم ہو رہے ہیں۔ ایک، ذہنی وسعت۔ اور دوسرے، جدید مواقع سے فائدہ اٹھانا۔

واپسی میں جب ہم قدیم جموں کے علاقہ میں پہنچے تو ایک جگہ سڑک کے ایک طرف چند ٹھیلے کھڑے ہوئے تھے۔ اس بنا پر وہاں سڑک تنگ ہو گئی تھی اور صرف ایک ہی گاڑی کے گزرنے کا راستہ باقی تھا۔ اتفاق سے عین اسی وقت سامنے کی سڑک پر ایک اور گاڑی آ گئی۔ ایک لمحہ کے لیے دونوں گاڑیاں رک گئیں۔ اس کے بعد سامنے والے ڈرائیور نے اپنی گاڑی پیچھے کی طرف چلا کر ایک کنارے کھڑی کر دی۔ اب ہماری گاڑی کے لیے راستہ کھل گیا۔ ہم تیزی سے گزر گیے۔ اس کے بعد دوسری طرف کی گاڑی بھی روانہ ہو کر آگے چلی گئی۔

کبھی آگے بڑھنے کے لیے پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ جن لوگوں کی ڈکشنری میں صرف آگے بڑھنے کا لفظ لکھا ہوا ہو، پیچھے ہٹنے کا لفظ ان کی ڈکشنری میں درج نہ ہو، ایسے لوگوں کے لیے اس دنیا میں اپنی منزل پر پہنچنا مقدر نہیں۔

ایک مسلمان ایک ادارہ کی طرف سے اس کی ایک شاخ کا مقامی انچارج تھا۔ اس نے فریب دہی کے ذریعہ اس کی اس عمارت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ اب وہ اپنے ناجائز قبضہ کو جائز ثابت کرنے کے لیے جھوٹا پروپیگنڈہ کرنے میں مشغول ہے۔

اس سفر میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مذکورہ واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس مسلمان کا کہنا ہے کہ ہمارے اکابر خود غاصبانہ قبضہ کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے اگر میں نے بھی ایک غاصبانہ قبضہ کر لیا تو اس میں کیا ہرج ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس کی کوئی مثال بتائیے۔ انھوں نے کہا کہ وہ مسلمان اس سلسلہ میں آپ کی مثال پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ نے جمعیۃ بلڈنگ (دہلی) کے دو کمروں پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ سراسر جھوٹی بات ہے۔ جمعیۃ بلڈنگ کا جو حصہ میرے پاس ہے اس کا میں باضابطہ کرایہ دار ہوں۔ جمعیۃ ٹرسٹ سوسائٹی کے سابق چیرمین حاجی عبدالعزیز صاحب کی رضامندی سے طرفین کے درمیان ایک تحریری اتفاق نامہ ہوا جس پر دونوں نے دستخط کیے۔ اس طرح طرفین کے متفقہ فیصلہ کے تحت اس کی کرایہ داری قائم ہوئی اور میں ۱۹۷۴ سے مسلسل ماہ بہ ماہ اس کا مقررہ کرایہ ادا کر رہا ہوں۔ کوئی بھی شخص ہمارے دفتر میں آکر ۱۹۷۴ سے اب تک کی رسیدیں دیکھ سکتا ہے۔

مذکورہ صاحب میرے جواب سے مطمئن ہوگیے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے صحیح صورت حال کا علم نہ تھا۔ اس مسلمان کا آپ کے خلاف پروپیگنڈا یقیناً ایک بہتان ہے۔ البتہ اگر وہ بھی آپ کی طرح عمارت کے اصل مالک سے اتفاق نامہ کرلے اور اس کے مطابق عمل درآمد کرے تو اس کے بعد اس کے معاملہ کو جائز معاملہ کہا جاسکتا ہے۔ ورنہ موجودہ صورت حال میں تو وہ خود اپنے اقرار کے مطابق غاصب اور خائن ثابت ہو رہا ہے۔

ایک صاحب نے لیتھو پر چھپا ہوا ایک اردو اخبار پیش کرتے ہوئے کہا: یہ ابھی ہفت روزہ ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ اس کو روزنامہ بنا دیا جائے۔ میں نے کہا کہ اصل اہمیت یہ نہیں ہے کہ ہفت روزہ کے بجائے روزنامہ ہو، اصل اہمیت یہ ہے کہ وہ معیار نامہ ہو۔ اردو زبان میں بے شمار اخبارات نکلتے ہیں، مگر شاید ان میں سے کوئی بھی نہیں جو جدید معیار صحافت کے مطابق ہو۔

میں نے کہا کہ حدیث میں ہے کہ اللہ جمیل ویحب الجمال۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جمال وکمال کے اعلیٰ معیار پر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ جو کام کریں وہ سطح خداوندی کے مطابق ہو۔ آج کل مسلمان جو اخبارات نکال رہے ہیں وہ جدید معیار صحافت کے اعتبار سے سطح انسانی کے مطابق بھی نہیں، کجا کہ ان کو سطح خداوندی کے مطابق کہا جائے۔

۶ نومبر ۱۹۸۷ کی سہ پہر کو انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۴۲۲ کے ذریعہ دہلی واپسی ہوئی۔ راستہ میں ہوائی کمپنی کے ماہنامہ سواگت (اکتوبر ۱۹۸۷) میں ایک مضمون پڑھا۔ یہ مغل یادگاروں کے بارہ میں تھا۔ اس مضمون میں اکبر (۱۶۰۵-۱۵۵۶) سے لے کر شاہجہاں

(۱۶۲۷ - ۱۶۵۸) تک کی مختلف عمارتوں کی تفصیل درج تھی۔ مضمون نگار مسٹر جگموہن مہاجن نے مغل عمارتوں کا با تصویر تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مغلوں کے ظہور کے بعد ہندستان کے فن تعمیر نے ایک نیا انداز اختیار کیا :

Indian architecture took on a new aspect with the advent of the Mughals (p. 81).

موجودہ مسلمان ماضی کے "لال قلعہ" اور ماضی کے "تاج محل" پر فخر کرتے ہیں۔ مگر آج کے ہندستان کو وہ کوئی نیا لال قلعہ اور کوئی نیا تاج محل نہ دے سکے۔ مسلمانوں کی اسی کوتاہی میں ان کی تمام محرومیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

۶ نومبر ۱۹۸۷ کی شام کو میں جموں سے دہلی واپس آیا۔

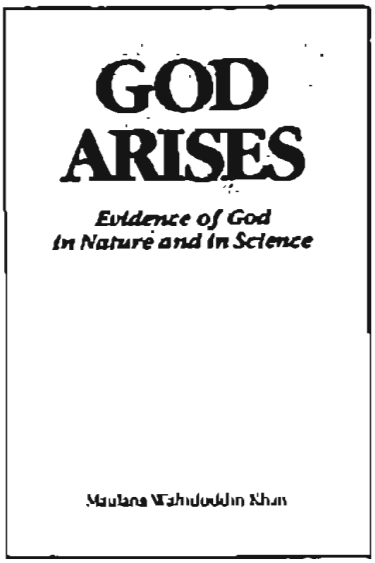

God Arises
by Maulana Wahiduddin Khan

This English edition of *Mazhab Aur Jadeed Challenge*, is an updated version, incorporating considerable additional material.

It has also been translated into a number of other languages, including Arabic, French, Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), Sindhi, Tamil, etc., and has come to be accepted as standard work on the Islamic position vis-a-vis modern thought.

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 Price Rs. 45.
81-85063-17-6

THE ISLAMIC CENTRE
C-29 Nizamuddin West New Delhi - 110 013

خبرنامہ اسلامی مرکز — ۳۶

۱۔ "فیسٹول آف انڈیا" کے تحت ۲۴ ستمبر ۱۹۸۷ سے لیکر ۲۰ جنوری ۱۹۸۸ تک روس کی راجدھانی ماسکو میں ایک نمائش ہوئی جس میں ہندستانی کتابوں کی نمائش بھی شامل تھی۔ اس موقع پر اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات بھی نمائش کے لیے رکھی گئیں۔ اس کا تذکرہ "نیشنل بک ٹرسٹ" کی شائع شدہ رپورٹ میں صفحہ ۱۴۸ پر کیا گیا ہے۔

۲۔ عربی پریس میں اسلامی مرکز اور اس کے کاموں کا تذکرہ مختلف انداز میں آتا رہتا ہے۔ مثلاً کویت کے عربی ماہنامہ الوعی الاسلامی (ربیع الاول ۱۴۰۸ھ) میں "الفکر الاسلامی" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں اسلامی مرکز کی مطبوعات کو اسلام کی فتح جدید قرار دیا گیا ہے۔ اصل الفاظ یہ ہیں :

اما عن اعلام الفکر الاسلامی الاصیل المعاصر فنذکر۔۔۔۔ وحید الدین خان، الذی تعتبر کتبه الاسلام یتحدیٰ و الاسلام والعصر الحدیث وحکمة الدین فتحًا جدیدًا فی دنیا الدراسات الاسلامیة (صفحہ ۲۵)

۳۔ ایک صاحب جو آجکل دمشق کے ایک کالج میں زیر تعلیم ہیں، اپنے خط (۴ نومبر ۱۹۸۷) میں لکھتے ہیں : ماہ اکتوبر کا الرسالہ موصول ہوا۔ ایک ہی مجلس میں پڑھ ڈالا۔ مغربی دنیا کا اسلامی اصولوں کی طرف رجوع معلوم ہوا۔ کتنا فطری ہے مذہب اسلام اور کتنے غیر فطری ہیں یہ مغربی وضع کردہ اصول۔ بلاشبہہ آپ کا یہ عصری اسلوب دین کی بڑی خدمت ہے۔ میں اس کا صفحہ صفحہ اپنے عرب ساتھیوں کو اور عرب طلبہ کو سنا رہا ہوں تو سب حیرت کرتے ہیں کہ یہ تو مغربی تہذیب کے شیدائیوں کے لیے تازیانہ ہے۔ پھر انھوں نے کہا کہ کاش یہ پرچہ عربی زبان میں بھی شائع ہوتا۔ ایک عرب طالب علم احمد عزالدین کے پاس آپ کی تمام عربی کتابیں موجود ہیں اور وہ آپ کے بڑے مداح ہیں۔ (شمس الدین ندوی)

۴۔ نئی دہلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترک میٹنگ میں ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۷ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ہوئی۔ تقریر کا موضوع تھا : انسانی خرابیوں کی جڑ کیا ہے۔

صدر اسلامی مرکز نے بتایا کہ "اللہ اکبر" تمام بھلائیوں کا سرچشمہ ہے اور "الانسان اکبر" تمام خرابیوں کا سرچشمہ۔

۵۔ نئی دہلی (گول مارکیٹ) میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک اجتماع ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۷ کو ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر سیرت رسولؐ کے موضوع پر تقریر کی۔ انھوں نے بتایا کہ انقلاب محمدی دنیا کا سب سے بڑا انقلاب تھا۔ دنیا کی ہر قسم کی ترقیاں براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسی کا فیض ہیں۔ اس تقریر کا ٹیپ مرکز میں موجود ہے۔

۶۔ صدر اسلامی مرکز کو جموں کے سیرۃ النبی کے اجتماع (۵ نومبر ۱۹۸۷) میں صدارت کے لیے بلایا گیا تھا۔ اس موقع پر انھوں نے شرکت کی اور وہاں تین تقریریں کیں۔ دو تقریروں کا موضوع سیرت نبویؐ تھا اور ایک تقریر جموں کی جامع مسجد میں نماز کے عنوان پر تھی۔ اس سفر کی تفصیلی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۷۔ الرسالہ نومبر ۱۹۸۷ (صفحہ ۴۵) پر "من انصاری الی اللہ" کے نام سے ایک اپیل شائع کی گئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ "ضرورت ہے کہ ہر مسلمان کم از کم ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم بھائی کے نام الرسالہ انگریزی کو اپنی طرف سے جاری کرائے"۔ اس سلسلہ میں مولانا محمد رضوان اختر صاحب (مقیم سعودی عرب) نے خود بھی لبیک کہا اور اسی کے ساتھ انھوں نے اس صفحہ کی فوٹو کاپیاں تیار کرائیں اور ان کو بہت سے مسلمانوں میں تقسیم کیا۔ یہ ایک قابل تقلید طریقہ ہے۔ دوسرے لوگوں کو بھی اس انداز پر اسے پھیلانا چاہیے۔

۸۔ ایک صاحب اپنے خط (۱۶ نومبر ۱۹۸۷) میں لکھتے ہیں: میں الرسالہ اردو کے علاوہ الرسالہ انگریزی ۵ عدد منگاتا ہوں اور غیر مسلم صاحبان کو بطور تحفہ دیتا ہوں۔ اب تو انگریزی الرسالہ ہمارے کچھ موٹرمین اور گارڈ اتنے شوق سے مانگتے ہیں کہ ۵ رسالے بہت کم پڑنے لگے ہیں۔ لہذا آپ انگریزی الرسالہ آئندہ دس عدد روانہ کیا کریں۔ مسٹر راڈریگ (موٹرمین ویسٹرن ریلوے) آج کل پیغمبر انقلاب (انگلش) پڑھ رہے ہیں اور بہت متاثر ہیں۔ ایک اور موٹرمین نے اکتوبر ۱۹۸۷ کا انگلش الرسالہ پڑھ کر بہت ہی خوشی کا اظہار کیا۔ مزید انگریزی کتابیں دو دو عدد روانہ کر دیں (محمد حنیف، بمبئی)

۹۔ اسلامی مرکز کے فکری حلقے خدا کے فضل سے پورے ملک میں ہیں اور ملک کے باہر بھی قائم ہیں۔ یہ لوگ اسلامی مرکز کے پروگرام کے تحت دینی اور تعمیری کوشش میں مصروف ہیں مگر اب تک ان کی خبریں "خبر نامہ" میں بہت کم آسکی ہیں۔ ایسے تمام حلقوں سے گزارش ہے کہ وہ "خبر" کی نوعیت کی باتوں کو روانہ کرنے کا اہتمام کریں تاکہ ہر ماہ ان کو خبر نامہ میں شامل کرکے شائع کیا جاسکے۔

۱۰۔ اسلامی مرکز کا فکر خدا کے فضل سے دن بدن پھیل رہا ہے۔ الرسالہ (اردو) الرسالہ (انگریزی) اور دوسرے مرکزی ذرائع کے ساتھ اب وہ "قومی پریس" کے ذریعہ بھی ملک کے وسیع تر حلقہ میں پہونچ رہا ہے۔ ملک کے انگریزی اخبارات میں "خطوط" کے علاوہ مفصل مضامین بھی چھپ رہے ہیں۔ دو مضمون یہ ہیں :

آرٹیکل مطبوعہ دی ٹیلی گراف ۲۲ جولائی ۱۹۸۷، آرٹیکل مطبوعہ دی ٹائمس آف انڈیا ۱۵ ستمبر ۱۹۸۷۔ اس نوعیت کے اور بھی کئی مضامین اور خطوط انگریزی اخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔

۱۱۔ محمود عبدالشکور شیخ صاحب (دھولیہ) لکھتے ہیں کہ فرقہ وارانہ فسادات کے مسئلہ میں میں آپ کے خیالات سے سو فیصد متفق ہوں۔ الحمدللہ آپ کے گرانقدر خیالات سے اکثریتی فرقہ کا امن پسند طبقہ متفق ہوتا جارہا ہے۔ اس کا ایک ثبوت ناسک سے شائع ہونے والے مراٹھی روزنامہ "گاؤں کری" کی ۲۴ جون ۱۹۸۷ کی اشاعت میں دیکھنے کو ملا۔ مذکورہ اخبار اپنے اداریہ میں لکھتا ہے کہ ..... "مولانا وحیدالدین خاں دہلی سے شائع ہونے والے اردو ماہنامہ 'الرسالہ' کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ بمبئی سے شائع ہونیوالے ایک روزنامہ میں خط لکھ کر انھوں نے اپنے 'مولانا پن' کا ثبوت دیا ہے۔ اس قسم کے مذہبی رہنما اگر ہر مذہب میں کثیر تعداد میں ہوگیے تو فرقہ وارانہ فسادات ختم ہونے میں بڑی مدد ملے گی۔ مولانا وحیدالدین خاں کے خیالات کا سبھی مذہب کے ماننے والوں کو احترام کرنا چاہیے"... آگے آپ کے خط کا خلاصہ شائع کرنے کے بعد آخر میں مذکورہ اخبار کہتا ہے : "مولانا وحیدالدین خاں کے خیالات وسیع تو ہیں ہی اس کے علاوہ وہ عظیم ترین بھی ہیں۔ اگر اس ملک میں ہر مذہب کے افراد نے امن قائم کرنے کیلئے اعراض کی پالیسی پر عمل کرنے میں پیش قدمی کی تو فرقہ وارانہ فسادات کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ یہ بات معلوم ہونے کے بعد کہ ایک دوسرے کا سر پھوڑ کر امن قائم نہیں ہوسکتا، برداشت کرلینے کی شدید ضرورت ہر مذہب کے لوگوں کو سمجھنے کیلئے مولانا کے خیالات بہت ہی قیمتی ہیں"

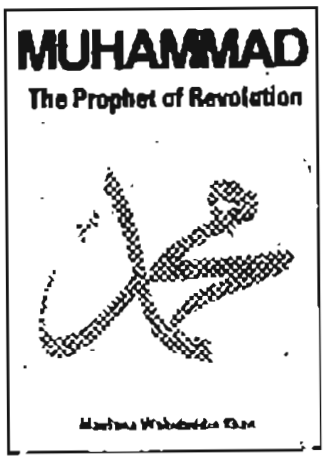

MUHAMMAD

The Prophet of Revolution

By

Maulana Wahiduddin Khan

In making the Prophet Muhammad the greatest figure, and consequently one of the most resplendent landmarks in human history, God has bestowed his greatest favour on mankind. Whoever seeks guidance cannot fail to see him, for he stands out like a tower, a mountain on the horizon, radiating light like a beacon, beckoning all to the true path. It is inevitable that the seekers of truth will be drawn up to the magnificent pinnacle on which he stands.

ISBN 81-85063-00-1 (PB Rs 50 $ 5)
ISBN 81-85063-07-9 (HB Rs 90 $ 9)

Maktaba Al-Risala
C-29 Nizamuddin West New Delhi - 110013

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

AL-RISALA

Annual Subscription Rates:

	One year	Two year
INLAND	Rs. 48	Rs. 90
ABROAD (By air mail)	US $ 25	US $ 50
(By surface mail)	US $ 10	US $ 20

SUBSCRIPTION FORM

Please send me AL-RISALA

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years

Name .....

Address .....

.....

GIFT SUBSCRIPTION

Please send AL-RISALA to my friend/relative to the following address:

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years I am enclosing cheque Postal Order/Bank Draft/M.O. Receipt No. .....

Name .....

Address .....

.....

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
AL-RISALA C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

D(SE) 243 R.N. No. 28822/76

January 1988 No. 134

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
〃 جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	30/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	4/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-
خاتونِ اسلام (مجلد)	
حقیقتِ حج (مجلد)	

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	35/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इंसान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳